جلد (۶) عدد (۶)
جمادی الآخرہ ۱۳۵۴ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۱

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صمہ)
قیمت فی پرچہ (۸ر)

خـــالی صفحـــه

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۴ھ جلد ۶ - عدد ۶ -

معذرت

گذشتہ چند مہینوں سے "ترجمان القرآن" کی اشاعت میں مسلسل تاخیر ہو رہی ہے خصوصاً جمادی الاولیٰ کا پرچہ تو بہت ہی زیادہ تاخیر کے ساتھ شایع ہوا۔ ناظرین میں سے بکثرت اصحاب نے اس کی شکایت کی اور اس شکایت میں وہ حق بجانب ہیں، لیکن ناظرین کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ رسالہ کی اشاعت میں جو بے ترتیبی واقع ہو گئی ہے ایسے اسباب کی وجہ سے ہے جن میں ہمارے قصد و اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں۔ سال رواں کے آغاز سے ادارۂ ترجمان القرآن جن مشکلات میں مبتلا ہے، ان کا ذکر اشاعتِ محرّم کی اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ مشکلات ہماری انتہائی جد و جہد کے باوجود ابھی تک باقی ہیں اور تین چار مہینے تک ان کے دور ہونے کی کوئی امید نہیں۔ لہٰذا ناظرین سے التماس ہے کہ جس طرح ہم اپنی مشکلات کا صبر سے مقابلہ کر رہے ہیں اسی طرح وہ بھی ہمارے شریکِ حال ہو کر مزید چند اشاعتوں تک اس بے ترتیبی کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم کو امید ہے کہ وہ بہت جلدی ہماری مشکلات کو رفع کر دے گا، اور اس کے بعد رسالہ اسی طرح پابندیِ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا جس طرح ابتدائی دو سال تک ہوتا رہا۔

جب مہینے کے خاتمہ تک رسالہ نہیں پہنچتا تو بعض حضرات کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں راستہ میں غائب نہ ہو گیا ہو۔ اور ہم اپنے قاعدہ کے مطابق دوسرا پرچہ بھیجنے کے لیے قیمت کی شرط نہ لگائیں۔ لیکن خریدارانِ ترجمان القرآن مطمئن رہیں کہ جب رسالہ تاخیر کے ساتھ شائع ہو گا تو ادارے کی طرف سے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا جائے گا، اور کسی خریدار سے ناجائز طور پر ایک پیسہ بھی وصول نہ کیا جائے گا۔

مینیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی کتاب "امہات الامہ" پر تبصرہ کرتے وقت ہم نے ان مضامین سے قصداً کوئی بحث نہیں کی جو کتاب کی ابتدا میں بطور مقدمہ درج کیے گئے ہیں، اس لیے کہ ان میں کتاب کے حسن و قبح پر کوئی بے لاگ علمی تنقید نہ تھی، بلکہ ان "مولویوں" پر جوابی لعن وطعن کیا گیا تھا جنہوں نے اس کتاب کی پہلی اشاعت کے وقت مصنف پر لعن وطعن کیا تھا۔ جب ہم نے دیکھا کہ "مولویوں" پر تنگ نظری تعصب اور بے انصافی کا الزام رکھنے والے خود بھی اسی حال میں مبتلا ہیں، اور ان کے ساتھ ایک ہی سطح پر کھڑے ہو کر لین دین کر رہے ہیں، تو ہم کو یہی مناسب نظر آیا کہ کتاب کے مخالفین اور موافقین دونوں کی تحریروں کو نظر انداز کر کے نفس کتاب ہی تک اپنے تبصرے کو محدود رکھیں۔ لیکن اب یہ بات ہمارے علم میں لائی گئی ہے کہ ان تمہیدی مضامین میں سے ایک (جس کے لکھنے والے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو و استاد کلیہ جامعہ عثمانیہ ہیں) دراصل حیات النذیر کے مقدمہ کا ایک ٹکڑا ہے اور جامعہ عثمانیہ کی بی۔ اے کلاس کے نصاب درس میں شامل ہے۔ اس علم کے بعد ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ان خیالات پر بھی تنقید کریں جو پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب نے "امہات الامہ" کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں، اس لیے کہ اگر نصاب تعلیم کے واسطے سے اس قسم کے خیالات کو ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کے دماغوں میں اترنے کا موقع دیا جائے، اور پھر انہی خیالات کی روشنی میں امہات الامہ جیسی کتابیں اس کی نظروں سے گذرنے لگیں تو اندیشہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں سے اپنی قوم کے اکابر اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے احترام کا وہ جذبہ رخصت ہو جائے گا جس کا موجود رہنا ہر قوم

میں خودداری اور عزت نفس کے بقا اور اطاعت احکام دینی کے لیے ضروری ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے مقدمہ حیات النذیر میں امہات الامہ پر اظہار خیال کا آغاز اس انداز سے کیا ہے کہ علماء کی طرف سے اس کتاب کی مخالفت میں جو کچھ کہا گیا وہ گویا سب کا سب حسد کی بنا پر تھا ورنہ دراصل کتاب میں کوئی برائی نہ تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمۂ قرآن کو جو مقبولیت نصیب ہوئی تھی، دراصل اس پر علماء ان سے "جلے بیٹھے تھے"، اور چاہتے تھے کہ کسی صورت سے ان کے ترجمے کی طرف سے لوگ بدگمان ہو جائیں، اور "ہمارا ترجمہ بکنے لگے" اس لیے جب امہات الامہ شائع ہوئی تو "ان کی بن آئی"۔ اور انھوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کو ایک بہانہ بنا لیا۔

کسی معاملہ کو پیش کرنے کا یہ انداز سراسر وکیلانہ ہے جس طرح ایک وکیل اپنے موکل کے مقدمہ کو پیش کرتا ہے، اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب نے مولوی نذیر احمد صاحب کے معاملہ کو پیش کیا ہے۔ اگر وہ ایک بے لاگ نقاد ہوتے تو واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر بیان نہ کرتے۔ واقعہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنی کتاب میں حضرت فاطمہ، حضرت عائشہ، حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عثمان، اور بزرگان اہل بیت پر جو چوٹیں کی تھیں ان پر بالعموم تمام ان مسلمانوں میں ہیجان برپا ہو گیا تھا جن کے دلوں میں اپنے بزرگان دین کے احترام کا جذبہ موجود تھا۔ ان میں صرف پرانے مولوی ہی نہ تھے بلکہ نئے تعلیم یافتہ بھی تھے مثلاً سر (اس وقت شیخ) عبدالقادر اور مولانا (اس وقت مسٹر) محمد علی مرحوم جنہوں نے کوئی ترجمہ قرآن شائع نہ کیا تھا، اور جن پر یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مولوی نذیر احمد صاحب سے حسد رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں چونکہ مرحوم کے خلاف ایک عام ناراضی پھیل گئی تھی اس لیے بعض وہ لوگ بھی طعن و تشنیع کی آوازیں بلند کرنے میں شریک ہو گئے جو فی الواقع اپنی ذاتی اغراض کے لیے مرحوم سے حسد رکھتے تھے۔ پس واقعہ تو یہ ہے کہ مخالفت کرنے والوں میں چند افراد کے سوا سب کے سب وہ تھے جو نیک نیتی کے ساتھ کتاب کو قابل ملامت سمجھتے تھے لیکن مولوی عبدالحق صاحب

اس واقعہ کو یہ شکل دے دی مخالفین میں اکثر و بیشتر حاسد تھے بلکہ مخالفت کی بنا ہی حسد پر قائم ہوئی تھی۔ کیا اس کو آزادانہ تنقید نگاری کہا جا سکتا ہے؟ مولوی عبدالحق صاحب نے بدنیتی کا جو الزام علماء پر لگایا ہے افسوس ہے کہ واقعات کو غلط صورت میں بیان کرنے کی وجہ سے وہ خود ان کی طرف عائد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جس شخص کا مقصد محض امر واقعہ کا اظہار ہو، اور جو انصاف کے ساتھ کسی چیز کے حسن و قبح کو بیان کرنا چاہتا ہو اسے کبھی یہ ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ واقعات کو بدل کر اپنے حسب منشا نتائج نکالنے کی کوشش کرے

اپنے ناظرین کے ذہن میں امہات الامہ کی طرف ایک ہمدردانہ رجحان پیدا کرنے، اور مخالفین کی طرف سے ان کو پوری طرح بدگمان کر چکنے کے بعد مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

> لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلماء کا جو اجلاس دلی میں ہوا، اس میں علمائے کرام تو موجود ہی تھے۔ انہوں نے باہم "مسکوٹ" کر کے امہات الامہ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور بکری موقوف کرا دی تھی، منگوائیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا، اور ان میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لئے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کہہ کے آگ لگا دی۔ اس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا سنگ دل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانا مرحوم بھی اسی آگ میں جھونک دیے جاتے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ مولویوں کا یہ حلقہ قرون وسطیٰ کے ان پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنہوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ ہستیاں آگ میں جھونک دیے کڑکڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دیے

گلوں میں پتھر باندھ کر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیے کتوں سے پھڑوا دیے اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب و غریب شکنجوں میں کس کس کو سسکا سسکا کر مار ڈالے۔ اور ان کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودۂ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک یادگار تھا۔ یہ راکھ اس قابل تھی کہ اس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشیوں میں بند کر کے رکھ لی جاتی تاکہ آیندہ نسلیں اسے سامنے رکھ کر ان علمائے کرام و مصلحان ملک و ملت کی ارواح پاک پر فاتحہ دلاتیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں۔ اس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال نامے میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات اُخروی کا باعث ہوگی۔ یہ ان بزرگواروں کا کام ہے جنہوں نے چشم بددور مسلمانوں کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کا بیڑا اٹھایا ہے"۔

اس عبارت کو جو شخص پڑھے گا وہ یہ سمجھے گا کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے چودھویں پندرہویں صدی عیسوی کے اہل حکمت کی طرح تحقیق علمی و اکتشاف حکمی کا کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا جس کو پوپ صفت تاریک خیال، قدامت پرست ملاؤں نے اپنے زعومات کے خلاف پا کر شور محشر بلند کر دیا، اور اپنے جہل و تنگ نظری کی بنا پر اس کو نذر آتش کر کے دنیا کو علمی تحقیق کے اس بیش قیمت ثمر سے محروم کر دیا! کیا فی الواقع اُمہات الامہ ایسی ہی چیز تھی؟ اگر نہ تھی اور یقیناً نہیں تھی، تو اس کے جلائے جانے کا حال اس پرجوش خطیبانہ انداز میں بیان کرنا کیا معنی؟ "اُمہات الامہ" کو پیش نظر رکھ کر جو شخص اس عبارت کا مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ لکھنے والے کے دل میں علماء کے خلاف جو جذبۂ نفرت دوسرے وجوہ کی بنا پر پہلے سے موجود تھا، وہ ہر اس فعل پر بھڑک اٹھنے کے لیے مستعد تھا جو علماء سے سرزد ہو عام اس سے کہ بجائے خود وہ جائز ہو یا ناجائز، بالفاظ دیگر اس جذبۂ نفرت کی شدت نے ذہن سے صحیح و غلط کے درمیان امتیاز کرنے، اور بعض فعل کی حیثیت سے صالح کر اس کے متعلق منصفانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت باقی نہ رکھی تھی، اور اس کے نزدیک مولوی کا فعل محض اس لئے کہ وہ مولوی کا فعل ہے، ہر قسم کی ملامت اور لعن طعن کا

مستوجب تھا اسی کو تعصب کہتے ہیں یہی تنگ نظری اور تاریک خیالی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس پر موجودہ زمانہ کے روشن خیال حضرات پرانے مولویوں کو مطعون کرتے ہیں نہ معلوم یہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ روشن خیالی وسعت نظر اور بے تعصبی ایک مخصوص گروہ کے لوازم ذات ہیں حتی کہ اگر اس گروہ سے برعکس صفات کا بھی ظہور ہو تب بھی وہ روشن خیال، وسیع النظر اور بے تعصب ہی رہے گا۔ انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کا اظہار جس سے بھی ہو اس کو تنگ نظر اور متعصب سمجھا جائے، خواہ وہ مسجد کے حجروں میں درس دینے والا ہو یا کالجوں میں لکچر دینے والا۔

علماء اگر اپنی حد جائز سے تجاوز کر کے کسی معاملہ میں ناروا شدت برتیں تو بلاشبہ اس پر انہیں ملامت کی جا سکتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کسی دوسرے گروہ کی ایسی ہی غلط روش پر کی جا سکتی ہے۔ اس معاملہ میں قابل لحاظ چیز نفس فعل کی نوعیت ہے، نہ کہ فاعل کی ذات۔ اور ملامت کی مقدار متعین کرنے میں بھی فعل کی نوعیت کا لحاظ ہونا چاہیے نہ کہ فاعل کی ذات کا۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں تو جدید و قدیم کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور انصاف پر فریقانہ تعصب (Party feeling) غالب آگیا ہے۔ ایک گروہ نے اپنے مخالف گروہ کو "فرقۂ ملائیہ" قرار دے لیا ہے، اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اس کی ہر بات پر ملامت کرنا، طنز و تعریض کے تیر برسانا، پھبتیاں کسنا، اور تمام ممکن طریقوں سے اس کو ذلیل کرنا ہمارا حق ہے، اور اس کام میں ہم جس قدر زیادہ مبالغہ کریں، اسی قدر زیادہ ہماری "روشن خیالی" کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی مخصوص اصطلاح کے لحاظ سے یہ "روشن خیالی" ہو۔ مگر عقل و خرد کی نگاہ میں تو یہ ایک دوسری قسم کی "پاپائیت" اور "ملائیت" ہے جو پرانی پاپائیت و ملائیت کے بالمقابل وجود میں آرہی ہے۔ اور درحقیقت اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ان "روشن خیالوں" کو کسی تاریک خیال ملا کے مقابلہ میں ممتاز کرتی ہو۔ ایک انتہا درجہ کے تنگ نظر ملا سے جس ذہنیت کا ظہور ہوتا ہے، وہی ہم کو یہاں بھی نظر آتی ہے۔ وہ بھی فرقہ بندی کرتا ہے۔ یہ بھی کرتے ہیں۔ وہ پرانی زبان میں گالیاں دیتا ہے۔ یہ نئی زبان میں دیتے ہیں۔ وہ کفر و فسق کا

فتوے لاتا ہے۔ یہ اس کے جواب میں زمانۂ وسطیٰ کے پادریوں سے اس کو تشبیہ دیتے ہیں جو ان کے نزدیک اسی پایہ کی تذلیل ہے جس پایہ کی تذلیل ملا کے نزدیک کسی کو کافر و فاسق قرار دینا ہے۔ غرض انصاف نہ اس کے پاس ہے نہ ان کے پاس عقل ہے نہ وہ کام لیتا ہے، نہ یہ پھر آخر وہ کونسی چیز ہے جس کی بنا پر یہ ملاؤں کے مقابلہ میں فضیلت کا دعویٰ کر سکتے ہیں محض خانقاہ اور کالج کا فرق تو کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔

یہ فریقانہ تعصب ہی ہے جس کی بدولت علماء کے گروہ سے وہ حقوق بھی سلب کر لیے گئے ہیں جو ہر گروہ اور ہر شخص کے جائز حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے باپ دادا کو گالیاں دی جائیں اور وہ اس پر غضب ناک ہو تو اس کا غصہ حق بجانب۔ اگر کسی قوم کے اسلاف کی توہین کی جائے اور وہ اس پر ناراض ہو تو اس کی ناراضی جائز۔ اگر کسی حکومت کے خلاف تحقیر آمیز خیالات ظاہر کیے جائیں اور وہ اس پر مقدمہ چلا دے تو برحق حتیٰ کہ اگر انجمن ترقی اردو کے معاملات پر کوئی مخالفانہ اظہار رائے کرے اور مولوی عبدالحق صاحب کو اس پر غصہ آئے تو وہ بھی روا لیکن اگر اصحاب و اہل بیت رسولؐ کی سیرتوں پر توہین آمیز طریقہ سے نکتہ چینی کی جائے، اور رکیک زبان میں ان کے حالات بیان کیے جائیں تو مولویوں کو یہ حق نہیں کہ اس پر غضب ناک ہوں وہ صداقت اور نیک نیتی کے ساتھ کسی ایسی کتاب پر غضبناک ہو ہی نہیں سکتے۔ ان کے جذبۂ غضب میں رشک و حسد کے عناصر کی جستجو کرنا اور نہ پائے جائیں تو ایجاد کر لینا ضروری۔ وہ اگر اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو "جلے پھپولے" پھوڑتے ہیں۔ اگر اس کے سدباب کا مشورہ کرتے ہیں تو "مسکوٹ" کرتے ہیں۔ اگر اس کو جلا دیتے ہیں تو اس الزام کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں جو کتب خانۂ اسکندریا کے معاملہ میں دشمنان اسلام نے حضرت عمرؓ کے سر تھوپا ہے!

مولوی عبدالحق صاحب نے کتاب کے جلائے جانے کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے ایک ناواقف آدمی یہ گمان کرے گا کہ علماء نے شدت غیظ میں یہ کوئی مجنونانہ حرکت کی تھی لیکن واقعہ جس طرح پیش آیا اس کی کیفیت مولوی حبیب الرحمن خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ سابق صدر الصدور امور مذہبی، حیدر آباد) کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد بعض اہل فہم کے سمجھانے بجھانے سے خود مؤلف مرحوم کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا اور انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھ سے غلطی ہوئی جس کو اب میں واپس لیتا ہوں۔ اس بنیاد پر انھوں نے تمام نسخ رسالہ مذکورکے (جو ان کے پاس موجود تھے) ان صاحب کے سپرد کر دیے جن کے سامنے اعتراف کیا تھا جو رسالے شائع ہو چکے تھے (ان کی تعداد ۹۰ تھی) ان کی فہرست دے دی اور اپنی طرف سے اجازت دیدی کہ وہ خریداران سے (اگر کہیں ہوں) واپس لے لیے جائیں۔ یہ بھی خواہش کی کہ ان کے اعتراف کا مسلمانوں کے کسی مجمع عام میں اعلان کیا جائے (مثلاً جمع کو جامع مسجد میں) اور تمام رسالے تلف کر دیے جائیں" (الناظر لکھنؤ مورخہ جنوری ۱۹۱۲ء بحوالہ "صدق" مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء)۔

پھر مقدمات عبدالحق کے مقدمہ میں شروانی صاحب اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء آخر وقت تک "امہات الامہ" کو جلانے پر آمادہ نہ تھے مگر مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم و مغفور نے خود جلانے پر اصرار کیا اور انہی کے زور دینے پر کتاب جلائی گئی۔ مقدمہ مقدمات عبدالحق صـ)۔

ایک معتبر گواہ کا یہ بیان پڑھیے، اور اس کے بعد پھر ایک نظر مولوی عبدالحق صاحب کی اس عبارت پر ڈالیے جس میں "امہات الامہ" کے ڈھیر پر مٹی کا تیل چھڑکنے اور آگ لگانے والے مولویوں کو زنادقہ وملحدین کے پادریوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

"مقدمات عبدالحق" کے فاضل مصنف علیگڑھ کے اس دور کی پیداوار ہیں جس میں قدیم وجدید کے درمیان شدید جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اور جانبین میں نہایت تلخ مخالفانہ جذبات کی آگ بھڑک رہی تھی اگر ان کے دل و دماغ میں اس زمانہ کی تلخیاں تازہ ہوں تو ایک امر فطری ہے۔ لیکن اس ورثہ کو ہماری آیندہ نسلوں کی طرف منتقل نہ ہونا چاہیے۔ وہ دور گذر چکا۔ اب نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت منافرت اور جنگ وجدال کے بجائے تعمیری افکار اور اصلاحی خیالات کے تحت ہونی چاہیے۔ اور ان کو گذرے ہوئے زمانہ کی ناخوشگوار یادگاروں سے محفوظ رہنا چاہیئے۔ اس لیے ہم جامعہ عثمانیہ کے ارباب حل وعقد کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی کتب نصاب سے ایسی تحریروں کو خارج کردیں جو کسی قسم کی تعمیری اور اصلاحی قیمت نہیں رکھتیں۔

مقالات

ورثۂ اسلامیہ کا ایک باب

تصوف اسلام ڈاکٹر نکلسن کی نگاہ میں

ترجمہ و تحشیہ جناب ذوقی شاہ صاحب

جناب ذوقی شاہ صاحب کا دلچسپ سلسلۂ مضامین "مکتب مادی پر ایک نظر" ان کی ناسازئ مزاج کی وجہ سے رک گیا تھا۔ امید ہے کہ عنقریب یہ سلسلہ پھر جاری ہوجائے گا۔ سردست انھوں نے ورثۂ اسلامیہ The legacy of Islam کے اس باب کا ترجمہ اپنے حواشی کے ساتھ ہمارے پاس بھیجا ہے جس میں پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے تصوف اسلام پر اپنی تحقیق کے نتائج پیش کئے ہیں۔ ایک حد تک یہ مضمون اس رسالہ کے دائرہ بحث سے ہٹا ہوا ہے۔ مگر ہم اس غرض کے لئے اس کو شائع کرتے ہیں کہ ایک طرف اسلام اور اسلامی تحریکات کے متعلق مغربی محققین کا مبلغ تحقیق معلوم ہو، اور دوسری طرف خود اپنی ان کمزوریوں کا حال بھی ہم پر روشن ہوجائے جن کی وجہ سے غیروں کو اسلام اور اہل اسلام پر طعن کا موقع ملتا ہے۔ تصوف کو سمجھنے میں ڈاکٹر نکلسن نے جو غلطیاں کی ہیں ان کو فاضل مترجم نے اپنے حواشی میں مختصراً واضح کردیا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ متاخرین کا تصوف جن مسائل میں اسلام کے مرکز سے منحرف ہوگیا ہے، ان کو ہمارے صوفیہ سمجھیں اور کتاب اللہ و سنت رسول کی طرف رجوع کریں۔ - ایڈیٹر

مقدمہ از مترجم | "دی لیگیسی آف اسلام" (The Legacy of Islam) یعنی "ورثۂ اسلامیہ" مولفہ

سر تامس آرنلڈ (آنجہانی) اور مسٹر الفریڈ گیلوم Alfred Guill aume ایک حال کی تالیف ہے جو انگلستان کے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے حال میں شائع ہوئی ہے اس کتاب میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر یورپین نگاہ سے نظر ڈالی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اسلام کا یورپ پر کیا اثر پڑا۔ مختلف ابواب مختلف مستشرقین یورپ کے قلم سے نکلے ہیں جس شخص کو جس مضمون کے ساتھ زیادہ مناسبت تھی اس نے اسی مضمون پر قلم اٹھایا اور مولفین نے ان مضامین کو کتاب کی صورت میں ترتیب دیکر ایک دیباچہ کا اضافہ کردیا۔ اس کتاب میں تصوف پر بھی ایک باب ہے جو مسٹر آر۔ اے نکلسن کا لکھا ہوا ہے مسٹر نکلسن کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں اور فارسی و عربی میں اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ تصوف کی کتابوں کا بخوبی مطالعہ کرسکیں۔ چنانچہ ان کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کا مطالعہ وسیع ہے اور انھوں نے مسائل تصوف کے سمجھنے میں اپنی دماغی قابلیت کو بھی پوری قوت سے صرف کردیا ہے مگر تصوف ان چیزوں میں سے نہیں جو محض مطالعہ کتب سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ جب تک روحانیات سے کسی شخص میں فطری مناسبت نہ ہو اور تصوف کے عملی پہلو سے وہ کیفی اور حالی آگاہی حاصل نہ کرے اس فن لطیف کی باریکیاں کماحقہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

اسلامی مسائل پر مستشرقین یورپ کی بیشتر تحریریں دیکھنے کے بعد مندرجہ ذیل نتائج میں سے کسی ایک نتیجہ پر لازمی طور پر آنا پڑتا ہے۔

(۱) باوجود علم وفضل کے لمبے چوڑے دعووں کے ان لوگوں میں اب تک صحیح اسلام کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔

(۲) یا یہ لوگ دیدہ و دانستہ اسلام کو بدنما بنا کر پبلک کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) یا پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ لوگ اسلام کا مطالعہ تحقیق حق کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ جاسوس بن کر دشمنی کی نگاہ اس پر ڈالتے ہیں اور اسے توڑ موڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

یہ لوگ غلط مبادیات سے ابتدا کرتے ہیں، اور غلط نتائج پر آتے ہیں۔ اسلام کو غلط معیار سے پرکھتے ہیں اور خود اپنی ہی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جس نگاہ سے وہ فلسفہ کو دیکھنے کے عادی ہیں اسی نگاہ سے مذہب کو بھی دیکھتے ہیں حالانکہ فلسفہ اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں فلسفہ کوشش انسانی کا نتیجہ ہے۔ مذہب حق تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ محدود انسانی معلومات، ناقص انسانی تجربوں کوتاہ نظر ضعیف البصر اور خام عقل انسانی کے تنگ و تاریک اور ناہموار میدان میں استدلال کے پائے چوبین کی گردشوں پر فلسفہ کے وجود کا انحصار ہے اور وحی الٰہی کی ہدایت بخش روشنی پر مذہب کا دار و مدار ہے دونوں چیزیں مختلف برتاؤ کا مطالبہ کرتی ہیں مگر جس قوم نے وحی الٰہی کو ابھی تک نہ سمجھا ہو اور جس کی علمی روشنی خالق و مخلوق کے صحیح تعلقات باہمی کی جانب رہنمائی کرنے میں ظلمت کا حکم رکھتی ہو اس قوم کے افراد اپنی ہی روش پر قائم رہ کر ایک سچے مذہب کے متعلق صحیح اصول پر کامیابی کے ساتھ تحقیقات نہیں کر سکتے۔ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ

ایک بڑی غلطی جس میں یہ لوگ اکثر الجھا کرتے ہیں یہ ہے کہ اسلام کو وہ ایک جدید مذہب سمجھتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مذہب کا بانی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں اجمالاً اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اسلام نہایت قدیم مذہب ہے۔ جس مذہب کی اشاعت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے کی وہ اسلام ہے اور اسی مذہب کی اشاعت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کی۔ ابتدائے آدم تا این دم جملہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں اصولاً کوئی اختلاف نہیں۔ صرف فروعی اختلافات ہیں جو ضرورت وقت اور مصلحت الٰہی پر مبنی ہیں عقائد اصول کے تحت میں آتے ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ انبیاء و مرسلین حق کی تعلیمات کے اثرات سے نہ حکمائے یونان محروم رہے نہ رہبان عیسوی نہ جوگیان ہند۔ اس حقیقت سے دیگر اقوام کے محققین بھی ناآشنا نہیں۔ چنانچہ الفرڈ ویبر اپنی کتاب تاریخ فلسفہ کے صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵ پر لکھتے ہیں کہ :-

"وسیع الخیال اصحاب غور و فکر مثلاً ماڈریٹس (Moderatus نکومیکس (Nichomacus) اور نیومینیس (Numenius) موسیٰ علیہ السلام کو یہودی افلاطون اور افلاطون کو یونانی موسیٰ کہنا پسند کرتے تھے"

پھر صفحہ ۱۸۶ پر وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"کوئی شخص افلاطون اور عیسائیت میں بعض مماثلتوں کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان مماثلتوں میں سے بعض اتنی قریبی اور ملتی جلتی ہیں کہ ان میں ذرا سا بھی اختلاف نظر نہیں آتا ان مماثلتوں کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بکثرت محققین یکجہتی سے اس امر پر متفق ہیں کہ افلاطون کا ماخذ عبارات کتب عہد عتیق ہیں۔"[1]

یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں نے حق میں اپنی طرف سے باطل کی بھی آمیزش کر لی، یقینیات میں ظنیات کو شامل کر لیا اور سچی تعلیمات کی اصلی صورت کو اپنی غلطیوں سے بگاڑ دیا۔ حق کو باطل کی آمیزشوں سے دور کرنے ہی کے لیے اور سابقہ ناکمل تعلیمات کی تکمیل کی غرض سے ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے ایسی صورت میں مسلمانوں اور فرقہائے سلف کے افعال و اقوال میں کہیں کہیں صوری شابہت یا معنوی مماثلت نظر آجائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ اسلام میں کوئی غیر اسلامی چیز بھی آکر شامل ہوئی ہے۔ حق بات کہیں بھی ہو مومن کی ملکیت ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پروفیسر نکلسن اپنے مضمون میں جابجا اپنی قیاسی کھینچ تان سے جو یہ بیان کرتے چلے گئے ہیں کہ مسلمان صوفیہ نے فلاں زمانے میں فلاں خیال فلاں گروہ سے اخذ کیا یہ ان کی نادانی، سادہ لوحی، اور یورپین ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ کی طرح مذہب بھی امتداد زمانہ سے اپنے

---

[1] الفریڈ ویبر (Alfred Weber) فرانس میں اسٹراس برگ یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ ان کی کتاب تاریخ فلسفہ کا انگریزی ترجمہ لانگمینس گرین اینڈ کمپنی (Longmans Green & co) نے لندن میں سنہ ۱۹۱۹ میں شائع کیا۔ (ذوقی)۔

متبعین کی قابلیت اور تجربوں کے ساتھ اپنی صفات ذاتی میں ترقی کرتا چلا آتا ہے۔

ایک اور بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی قاعدہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر اپنے زمانے میں اپنی امت کو تعلیم اس طریقہ سے دیتا ہے جسے آجکل انگریزی اصطلاح میں ڈائرکٹ متھڈ Direct Method کہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نبی نے خود وضو کرکے تبلادیا کہ وضو اس طرح کرتے ہیں نماز پڑھ کر تبلادی کہ نماز یوں پڑھتے ہیں۔ لوگ ان باتوں کو بہت آسانی سے حاصل کرتے ہیں اور اس حصول میں انھیں نہ کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے نہ وہ اصطلاحات کے محتاج ہوتے ہیں۔ مگر بعد کے زمانوں میں ان امور کی وضاحت کے لیئے اصطلاحات وضع کرنے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے اور کتابوں کے لکھنے کی بھی۔ زمانہ جس قدر قرن اول سے بعد اختیار کرتا جاتا ہے اسی قدر اصطلاحات اور تصانیف میں وضاحت کی بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے پہلے زبان وجود میں آتی ہے بعد میں اس کی صرف ونحو لکھی جاتی ہے۔ اور مختلف طلبار کی قابلیت کے لحاظ سے مختلف انداز سے بیان کی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ عموماً متقدمین کی تصانیف تصوف میں اجمال اور متاخرین کی تصانیف میں تفصیل پائی جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کچھ متاخرین نے لکھا ہے وہ اصل چیز میں اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے بلکہ ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق اپنے زمانے کے لوگوں کی ذہنیت اور استعداد کو مدنظر رکھ کر اصلی چیز ہی کو جس وضاحت اور صفائی اور عمدگی سے ہوسکتا ہے بیان کرتا ہے۔ امام غزالی ؒ نے اگر تصوف کو اس انداز سے بیان کیا کہ جو لوگ پہلے اس سے منحرف تھے وہ اس کے دلدادہ ہوگئے تو یہ امام غزالی ؒ کے انداز بیان کی خوبی ہے نہ یہ کہ انہوں نے نعوذ باللہ اپنی طرف سے تصوف یا اسلام کی صورت کو بدلدیا ہو۔ قرآن شریف کی کتابت میں پہلے اعراب نہ دیئے جاتے تھے بعد میں ضرورت متقضی ہوئی کہ اعراب دیئے جائیں۔ اس سے اگر کوئی یورپ والا یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن میں زیر زبر پیش کا بعد میں اضافہ ہوا تو یہ بات اس کی انتہا درجہ کی نادانی پر دلالت کرے گی۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی لغزشیں

پروفیسر نکلسن سے بھی سرزد ہوئی ہیں۔

اس کتاب کا نام "ورثۂ اسلامیہ" بھی اہل یورپ کی اسلام کے متعلق ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ الحمد للہ کہ اسلام مردہ نہیں کوئی مسلمان اس کتاب کو لکھتا تو اس کا نام

"زندہ اسلام کے زندہ اثرات"

رکھتا اور وہ کتاب بفضلہ تعالیٰ ان عیوب سے بھی پاک ہوتی جو اس انگریزی کتاب میں پائے جاتے ہیں کاش کوئی صاحب اس کا ترجمہ کرکے حواشی ہی کے ذریعہ سے ان عیوب کو دور کردیں۔

ذیل میں پروفیسر نکلسن صاحب کے مضمون کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ ذوقی

"تصوف" از ڈاکٹر نکلسن زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ میں انڈرہل کی کتاب مِسٹِسزم (Mysticim) کا مطالعہ کررہا تھا کہ اس کے ابتدائی صفحات پر میری نظر سے دو مقولے گذرے۔ ایک تو جرمنی کے زمانۂ وسطیٰ کے ایک روحانی شخص کا تھا، اور دوسرا انگلستان کے ایک مصنف کا جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ان مقولوں کو دیکھکر مجھے معاً یہ خیال گذرا کہ میں ان دونوں سے ملتے جلتے مسلمانوں کے مقولے بھی پیش کرسکتا ہوں[1] ایکہارٹ (جرمنی) کا مقولہ یہ ہے کہ:- "مخلوق جو کہ نیستی محض ہے انا کے استعمال کی مجاز نہیں اور یہ لفظ صرف خدا ہی استعمال کرسکتا ہے" اس مقولہ نے میرے دل میں اس یاد کو تازہ کردیا کہ ساڑھے تین سو سال قبل بغداد میں ابوالنصر سراج نے توحید کی تعریف کے سلسلہ میں بیان کیا تھا کہ "سوائے خدا کے کسی کی مجال نہیں کہ انا کہے کیونکہ انا کہنا حقیقی خدا ہی کو سزاوار ہے"۔ اور ایڈورڈ کارپینٹر (انگلستان) کا مقولہ یہ ہے کہ:- "اس مشاہدہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جملہ حواس ملکر ایک حس بنگئی

---

[1] پروفیسر نکلسن نہ تو یہاں تصوف کی تعریف بیان کرتے ہیں۔ نہ کسی اور طریقہ سے سمجھاتے ہیں کہ تصوف کسے کہتے ہیں۔ ابتدا ہی سے ان کی نظر مختلف اقوام کے مقولوں کی مماثلتوں پر ہوتی ہے اور انہیں مماثلتوں کو آگے چلکر وہ شہادتیں قرار دینے لگتے ہیں۔ (ذوقی)

اس مقولہ نے میری رہنمائی مصر کے شاعر اور ولی ابن الفارض (سنہ ۱۲۳۵ء) کے اُن اشعار کی جانب کی جن کا مطلب یہ ہے کہ :۔ ”میری آنکھ بولتی تھی اور میری زبان دیکھتی تھی۔ میرے کان باتیں کرتے تھے۔ اور میرے ہاتھ سنتے تھے جس وقت کہ میرا کان آنکھ بنا ہوا تھا اور سب کچھ دیکھتا تھا میری آنکھ کان بنی ہوئی تھی اور گیت سُن رہی تھی“۔ اس کا منشا یہ ہے کہ مشاہدۂ خاص میں اس کے تمام حواس متفق تھے اور ایک ہی کام کر رہے تھے۔

یہ ایک تو ارد ہے جو بادی النظر میں شہادت کا حکم رکھتا ہے کیفیات روحانی او بصیرت عرفانی میں مغرب اب بھی اسلام سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ازمنہ متوسطہ میں جب کہ مسلمانوں کے فلسفہ اور علوم کی شعاعیں ان کے اندلسی مرکز سے نکلکر عیسوی یورپ پر پڑ رہی تھیں اور وہاں روشنی پھیلا رہی تھیں یورپ نے جو کچھ مسلمانوں سے سیکھا اور حاصل کیا اُس کی تفصیل ابھی تک دریافت طلب ہے مگر اس میں شک نہیں کہ سیکھا بہت کچھ۔ حیرت کی بات ہوگی اگر اسلامی تصوف کے اثر سے ٹامس ایکوئناس، ایکہارٹ، اور ڈانٹے جیسے لوگ بچے ہوں۔ کیونکہ تصوف کی مشترکہ زمین پر زمانۂ وسطیٰ میں عیسویت اور اسلام باہم بہت متصل تھے۔ یہ واقعہ تاریخ پر مبنی ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس سے اس امر کا پتہ چل جائیگا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک اور مسلمان ارباب رہبنت روحانیت کے خیالات اور طریقوں میں اس درجہ مماثلت ہے کہ دونوں ایک ہی سی روحانی فضا کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیتھولک چرچ نے تو اپنی ان روایات کو قائم رکھا مگر تیرہویں صدی عیسوی کے بعد اسلام میں روحانیت نے اس مذہب جدید کے فلسفہ کی جانب رخ کیا جو تشرع لوگوں کی نگاہ میں مذہب حقیقی سے بالکل مختلف ہے۔

دوسری صدی ہجری کے اختتام کے قریب (سنہ ۸۱۶ء) ہمکو عراق میں لفظ صوفی سے سابقہ پڑتا ہے جس نام سے کہ بعد میں روحانی مسلمان پہچانے جانے لگے۔ اس کا صوف سے مشتق ہونا جو کہ

عیسائی راہبوں کا لباس تھا منجملہ اُن علامات کے ہے جو کہ اس جانب رہنمائی کرتی ہیں۔ ماخذ کے مشکل سوال پر یہاں بحث نہیں ہوسکتی۔ ہم پہلے اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ تصوف کی اصل اسلام ہے۔ صوفیاء کا یہ دعوی کہ انہوں نے تصوف کو پیغمبرؐ سے اخذ کیا قابل وقعت ہے۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو پیغمبرؐ کی شخصیت کے متعلق صحیح حالات لے کر ہم تک پہنچی ہے۔ اور اس میں رہبانیت اور اسرار مذہب کے عناصر دیگر عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔ رہبانیت کے عناصر پر صوفیا نے پیغمبر صاحب سے بھی زیادہ زور دیا ہے اور زیادہ گہرے معنی پہنائے ہیں مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تصوف نے قرآن سے کچھ نہیں لیا۔ مسلمان جو کہ اپنی کتاب مقدس کا ہمیشہ سے بڑا احترام کرتے چلے آئے ہیں اور بچپن ہی میں اسے حفظ کر لیتے ہیں اور بڑے غور و خوض سے اس کی تلاوت کرتے ہیں اور تمام انسانی علوم کے حصول کی اُسے کنجی سمجھتے ہیں، اس خیال کی کسی طرح تائید نہیں کر سکتے۔ اور تاریخی اعتبار سے یہ بات ہے بھی غلط۔ گو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے الٰہیات کے متعلق اصولاً ظاہری یا باطنی تعلیم باقاعدہ اور واضح طور پر نہیں دی[1] تاہم قرآن میں دونوں کے لئے (یعنی ظاہری اور باطنی تعلیم کے لیے) خام مسالہ موجود ہے۔ خدا کے متعلق پیغمبر صاحب کے بیانات بیشتر جذبات اور کمتر غور و خوض کا نتیجہ ہیں اور ان بیانات میں بظاہر کوئی صوری تطبیق نہیں[2]۔ متکلمین اسلام نے اپنے عقائد میں اللہ تعالیٰ کے رفیع الدرجات اور

---

[1] بریں عقل و دانش بباید گریست۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الٰہیات کے متعلق جتنی اچھی اور جتنی مکمل تعلیم دی ہے اس سے بہتر نہ کسی اور نے دی نہ کوئی اور دے سکتا ہے۔ (ذوقی)۔

[2] خدا کے متعلق نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بیانات نہ جذبات پر مبنی ہیں نہ غور و خوض پر بلکہ وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہیں جو سائنٹیفک تحقیقات سے ماوراء ہے۔ بیانات مذکورہ میں اہل حجاب کے نزدیک باہم تطبیق صوری کا بظاہر نہ ہونا کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ اللہ تعالیٰ جامع اضداد ہے اور اسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا جس نگاہ سے ایک انسان کو دیکھا جاتا ہے۔ وہ لامحدود ہے اور جملہ اقسام کے تقییدات سے پاک۔ ذوقی

برتر ہونے کو داخل کیا مگر صوفیا نے اتباع رسول میں اپنے عقائد میں اللہ کے رفیع الدرجات اور برتر ہونے کے ساتھ اس کے جاری اور ساری (حاضر و ناظر) ہونے کو بھی شامل کرلیا اور گو موخر الذکر امر کی جانب قرآن میں اشارات ہیں مگر وہ اشارات اس درجہ واضح اور نمایاں نہیں جتنا کہ صوفی اُنھیں واضح اور نمایاں اور اہم قرار دیتے ہیں۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا (النور ع۵)
ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ۔	وہی اول وہی آخر - وہی ظاہر وہی باطن - (الحدید ع۱)
لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ	نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہ، ہر چیز ہالک مگر ذات اس کی (القصص ع۹)۔
وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ۔	اور پھونک دی بیچ اس کے روح اپنی سے (الحجر ع۳)
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ (ق۔ ع۲)	اور البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو کچھ کہ خطرہ اس کے دل میں گذرتا ہے اور ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ	پس جس طرف تم منہ کرو وہیں اللہ کا بھی منہ ہے (البقرہ ع۱۴)
وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ۔	اور جس کو اللہ نور نہ عطا فرمائے اس کے لیے کہیں نور نہیں۔ (النور ع۵)۔

آیات مندرجہ بالا میں تمہارے تصوف یقیناً موجود ہیں اور صوفیائے متقدمین کے لیے قرآن صرف خدا کا کلام ہی نہیں بلکہ خدا سے قرب حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ بھی ہے۔ کثرت عبادت اور قرآن پر بالعموم بہت مجموعی اور بالخصوص سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورۃ النجم کی پہلی اٹھارہ پراسرار آیات جو کہ معراج سے متعلق ہیں غور و خوض کرنے اور مراقب رہنے سے اُن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

آلہٖ وسلم کے مشاہدات کو خود حاصل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

اب زمانی اور مکانی حالات پر بھی ذرا نظر ڈال دیکھو۔ جس سیاسی انقلاب نے دارالسلطنت کو دمشق سے بغداد کی طرف منتقل کیا اس نے اسلام کو ایک قدیم تر تمدن سے بھی متصل اور متصادم کر دیا اور گو بالآخر اسلامی غلبہ نے اجنبی خیالات کو مٹا دیا مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس نوعیت کے مقابلوں میں غلبۂ کامل کبھی نہیں حاصل ہوتا۔ ہمارے زیر بحث اس وقت وہ عالمگیر تحریک ہے جو اُن ممالک میں پھیل گئی تھی جہاں مسلمان مذہبی مباحثوں اور مناظروں میں عیسائیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کے ساتھ رات دن مصروف رہتے تھے اور جہاں محکوم قومیں جو کہ نومسلم تھیں اپنے جدید اختیار کردہ مذہب کو اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش میں بعض مرتبہ صدق دلی کے ساتھ اپنی پرانی محبوب باتوں اور رسموں کی تائید میں تعلیمات سے مصالحہ فراہم کر لیتی تھیں۔ صوفیوں کو قرآن کے باطنی پہلوؤں کا مطالعہ کنندہ تسلیم کرنا درست ہے مگر میرے خیال میں تصوف کو محض قرآن ہی کی تعلیم کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں سنہ ۸۰۰ء کے بعد تصوف نے یونانی فلسفہ کو اپنے میں جذب کرنا شروع کر دیا اور اب تک جو تاریخی شہادت مہیا ہو سکی ہے اُس سے اسی جانب اشارہ پایا جاتا ہے کہ تصوف کا ماخذ اور اس کی ابتدائی نشو نما عیسائی رہبان اور یونانی باطنیوں کے اثرات سے متعلق ہے۔ ہم اچھی طرح یقین کر سکتے ہیں کہ عیسائی راہب کی شکل وصورت سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خوب آشنا ہوں گے اور اس شکل وصورت نے آپ کے متبعین کے لیے ایک نمونہ پیش کیا ہوگا جس کے مطابق وہ لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہوں گے[ل] یہ مشہور کلمات کہ لارہبانیۃ فی الاسلام جو کہ آپ سے منسوب کر دیئے گئے ہیں درحقیقت زمانۂ مابعد کا ایک انحراف ہے جو عیسائی تخیل کے خلاف کیا گیا ہے اور عیسائی اثرات کے اس قوت کے غلبہ کا ایک ثبوت ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبر صاحب نے قرآن میں رہبانیت کو جس میں کہ ترکِ دنیا

ل "ہوگا" اور "ہوں گے" کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے اور ان ظنیات کی بنا پر پروفیسر صاحب کے استدلال کو ملاحظہ فرمائیے۔ (ذوقی)

بھی شامل ہے منع فرمایا ہے مگر سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲ کی تفسیر جو کہ تیسری صدی ہجری کے آخر تک تسلیم کی گئی ہے یہ ہے کہ آپ نے رہبانیت کا حکم اس حیثیت سے فرمایا کہ وہ خدا کی مقرر کردہ ہے اور مذمت کا مستحق انہی کو قرار دیا جنہوں نے اس کو بگاڑ دیا[1]

ابتدائی زمانہ کا اسلامی تصوف آنے والے عذاب الیم کی دہشت اور خوف، روزے اور گریہ، زہد اور تقویٰ اور مناجاتوں کا ایک آتش خانہ تھا جس میں اس تصوف کی پرورش ہوتی تھی۔ لا الٰہ الا اللہ کے ہوتے ہوئے خدا کی عبادت، دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے کرنا چونکہ خدا کے ساتھ ایک اور معبود کو شامل کر لینا ہے یعنی غیر اللہ سے محبت یا خوف کو دل میں جگہ دے لینا ہے اس لئے صوفی صرف خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہے جسے توکل کہتے ہیں اور خدا ہی کی رضامندی سے خوش ہوتا ہے جسے رضا کہتے ہیں مگر یہ قول فیصل نہیں معبودان باطل سے علیحدگی کا لازمی نتیجہ معبود برحق سے کامل لگاؤ ہے اور تصوف کی زبان میں اس کامل لگاؤ کو واصل بحق ہونا کہتے ہیں اور یہ وصل عشق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر سارے مذہبی اور اخلاقی تصوف کا دارو مدار ہے۔ ہمارے (یعنی یورپ کے) مستند مصنفین نے اس خیال کو سب سے پہلے جن کے کلام میں وضاحت کے ساتھ اور نمایاں طور پر پایا وہ ایک

---

[1] یہاں تو پروفیسر صاحب نے غضب ہی کر دیا۔ اول تو قرآن میں جو احکام آئے ہیں وہ پیغمبر صاحب کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ دوسرے جس آیت کی رو سے رہبانیت کو پروفیسر صاحب حکم الٰہی کے مطابق قرار دیتے ہیں یہ ہے۔ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ "اور رہبانیت انہوں نے (یعنی نصاریٰ نے) اپنی طرف سے نکالی تھی۔ ہم نے اسے ان پر نہ لکھا تھا (یعنی ہم نے انہیں اسکا حکم نہ دیا تھا) مگر فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (انہوں نے خود اسے) اللہ کی رضامندی کی تلاش میں اختیار کیا تھا تو احکام حق ادا کرنے کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے تھی مگر انہوں نے رعایت نہ کی اس کی جیسا کہ حق تھا رعایت کرنے کا۔ پس دیا ہم نے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے ان میں سے۔ تو اب ان کا اور بہت ان میں سے فاسق ہیں"

اس آیت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رہبانیت کا حکم خدا کی طرف سے نہ تھا بلکہ ایک بدعت تھی جو کہ خود نصاریٰ نے ایجاد کی تھی اور پھر بھی اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ (باقی)

ولیہ ہیں جو رابعہ بصریہ کے نام سے موسوم ہیں (۱۸۰ھ[1])۔ وہ ایک لونڈی تھیں جن کے والدین کی بابت کوئی علم نہیں۔ معلوم نہیں کہ جو اشعار ان سے منسوب ہیں وہ اُن کے ہیں بھی یا نہیں۔ مگر ان اشعار میں ایک صوفی کا نصب العین ان قلبی کیفیات کو قرار دیا گیا ہے جو محبوب کے تصور سے دل میں برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ۔

"دو وجوہ ہیں جن سے مجھے تیری محبت ہے۔ ایک ذاتی وجہ۔ اور دوسری وجہ یہ کہ تو مستحق ہے اس کا کہ تجھ سے محبت کی جائے۔ خود غرضانہ محبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں مگر میرا ہر خیال تیری محبت سے سرشار ہے۔ سب سے زیادہ خالص محبت تو وہ ہے جس میں تو میری نگاہ پرستش کے سامنے نقاب اٹھا دے۔ اس میں میری کوئی تعریف ہے نہ اُس میں بلکہ ہر بات میں قابل تعریف تو ہی ہے[2]"

یہ عقیدہ کہ وصول الی اللہ محبت حق ہی پر موقوف ہے قرآن میں تو بہت کھینچ تان سے پایا جاتا ہے مگر (مشکوٰۃ کیا حلبی) احادیث نبوی میں بہت زیادہ واضح ہے۔ مثلاً خدا فرماتا ہے کہ میرا بندہ میرے قریب آتا ہے زائد از ضرورت افعال (نیک) سے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں ہو تا ہوں اس کا کان تاکہ مجھ سے سُنے اور اس کی آنکھ تاکہ مجھ سے دیکھے اور اس کی زبان تاکہ میرے ذریعہ بات کرے اور اس کا ہاتھ تاکہ میرے ذریعہ گرفت کرے[3]"

---

[1] حضرت رابعہ بصریہ کے تفصیلی حالات اور کم سنی میں ان کے والدین کے فوت ہو جانے کے واقعات حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ نے اپنی مشہور کتاب تذکرۃ الاولیا میں درج فرمائے ہیں۔ ذوقی۔

[2] تعجب ہے کہ بقول پروفیسر نکلسن مصنفین یورپ کو یہ خیال سب سے پہلے حضرت رابعہ بصریہ کے کلام میں نظر آیا اور قرآن پاک کی اس آیت پر نگاہ نہ پڑی:۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے ہیں اللہ سے اشد درجہ کی محبت (یعنی عشق) رکھتے ہیں)۔ اس آیت کی رو سے تو ایمان کا دار و مدار ہی عشق الٰہی پر ہے۔ پھر یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ اور قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ اور اس نوعیت کی دیگر آیات کو نہ دیکھا اور محبت الٰہی کو اسلام میں بعد کی چیز کہدیا۔ جن لوگوں کی قرآن دانی کا یہ حال ہو انہیں اسلامی مسائل پر قلم اٹھانے کی جرأت کیونکر ہوتی ہے؟ ذوقی۔

[3] جس حدیث کی جانب یہاں اشارہ ہے اس کی صحیح عبارت حسب ذیل ہے لَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا "اور ہمیشہ رہتا ہے بندہ میرا نزدیکی ڈھونڈھتا طرف میرے ساتھ نوافل کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کثرت ذکر الٰہی سے صوفیاء اپنے سلوک کو شروع کر کے معرفت تک پہنچتے ہیں اور معرفت کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر کے مراتب توحید کو معلوم کیا جائے۔ اس باطنی زندگی کی تشریح جو کہ تجربہ پر مبنی ہو سب سے پہلے بصرہ کے حارث محاسبی (۸۵۷ء) نے بیان کی۔ ان کی تصنیف رعایہ لحقوق اللہ جس کا ایک ہی قلمی نسخہ باقی ہے اور اکسفورڈ میں اب تک موجود ہے نزاکت خیال اور جدت کا پتہ دیتا ہے، مگر اس میں موسوی اور عیسوی مأخذ سے بہت کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ بقول مصنفین مابعد طریقت مشتمل ہے مقامات واحوال پر۔ پہلا مقام توبہ کا ہے۔ اس کے بعد اور مقامات کا سلسلہ آتا ہے مثلاً ترک، زہد، توکل ہر مقام آنے والے مقام کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے تفصیل میں اختلاف ہے مگر اجمال وعمومیت میں کوئی اختلاف نہیں۔ سالک کا سبق یہ ہوتا ہے کہ افعال قلب کا زیادہ خیال رکھے بہ نسبت افعال جوارح کے، نیت کو عمل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دے، اور احکام شریعت کی تعمیل کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ ان احکام میں بالاتر حقائق کی جانب اشارات وہدایات ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان اصولوں میں قانون شکنی کی جانب میلان ہے ان کا اثر مسلمان فقہا پر اور غزالی (۱۱۱۱ء) جیسے زبردست عالم الٰہیات پر اور سعدی (۱۲۹۱ء) جیسے ماہر اخلاقیات پر غالب رہا ہے صوفیوں پر یہ الزام تو نہیں آسکتا کہ انہیں اپنی جان کے ساتھ محبت رہی ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ بعض اوقات انہوں نے محبت الٰہی کی خاطر اپنے خارج از جماعت ہمسایوں کو بالخصوص ضرر پہنچایا۔ مگر آخر میں جا کر ان کے توحید کے تخیل نے ان کے لیے اس بات کو ناممکن کر دیا کہ وہ خدا سے تو محبت کریں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔
احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر یہاں تک کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو اور جس وقت کہ
بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا دوست رکھتا ہوں میں اس کو پس ہوتا ہوں میں شنوائی
وان سالنی لاعطینہ ولئن استعاذ نی لاعیذنہ (رواہ بخاری) اس کی کہ سنتا ہے ساتھ اس کے اور بینائی اس کی کہ دیکھتا ہے
ساتھ اس کے اور ہاتھ اس کا کہ پکڑتا ہے ساتھ اس کے اور پاؤں اس کا کہ چلتا ہے ساتھ اس کے اور اگر مانگتا ہے مجھ سے یہ
بندہ البتہ دیتا ہوں میں اس کو اور اگر پناہ پکڑتا ہے ساتھ میرے البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو۔"
مسٹر صاحب کے نزدیک یہ حدیث مشکوک یا جعلی ہو تو ہو۔ ان کے نزدیک تو نعوذ باللہ قرآن بھی مشکوک یا جعلی ہے۔
مگر مسلمانوں کے نزدیک یہ حدیث نہایت صحیح ہے (د و ق)

مگر خدا کی مخلوق سے محبت نہ کریں۔

تیسری صدی ہجری کے صوفیوں نے اس باطنی مذہب کی مکمل طور پر علمی و عملی بنیادیں ڈالیں۔ ذوالنون مصری نے اسلام میں معرفت کے تخیل کو داخل کیا اور اس معرفت کا مفہوم یہ ہے کہ بخلاف استدلال اور روایات کے ذریعہ علم حاصل کرنے کے کیف و حال کے ذریعہ علم حاصل کیا جائے جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے خدا کو کیسے جانا تو جواب دیا کہ "عرفت ربی بربی" یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے رب ہی کے ذریعہ سے پہچانا۔ اور مثل ڈیونیسیس (Dionysius) کے ان کا بھی مقولہ یہ ہے کہ :- خدا برعکس[1] ہے ہر اس چیز کے جو کہ تمہارے خیال میں آسکتی ہو"۔ اور ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ :- "خدا کا جس قدر عرفان حاصل ہوتا جاتا ہے اسی قدر بندہ خدا میں فنا ہوتا جاتا ہے"۔ اس زمانہ کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ اشارات و اصطلاحات کا استعمال زیادتی کے ساتھ شروع ہو چلا اور ان علوم کو خواص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اور نجس کانوں[2] سے محفوظ رکھا گیا۔ ایران کے ابویزید یعنی بایزید بسطامی نے فنا کے عقیدہ کا اضافہ کیا ممکن ہے کہ اس میں وہ ہندوستان والوں کے اُس فلسفیانہ عقیدہ سے متاثر ہوے ہوں کہ ہر چیز کی جڑ ایک ہی ہے۔ اس کے بعد ہی فنا کا اثباتی لازمہ بقا بھی شامل عقائد[3] کر دیا گیا۔ توحید خالص تک پہنچنے میں ہر چیز کی نفی کرتے چلے جانے کی انتہائی کوشش نے بقول بایزید ہی کے ان پر سے

[1] پروفیسر نکلسن کو یہاں بھی التباس ہوا۔ ایسے موقعوں پر صوفیائے کرام لفظ "برعکس" نہیں استعمال کرتے بلکہ "ماورا" یا "برتر" یا اسی نوع کے دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم + وز ہرچہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
اور یہ بات قرآنی تعلیم لیس کمثلہ شئی کے بالکل مطابق ہے (ذوقی)۔

[2] یہاں بھی بجائے "نجس کانوں" کے جو الفاظ صحیح طور پر استعمال کئے جاتے ہیں "نا اہلوں کے کانوں سے" (ذوقی)

[3] "فنا" اور "بقا" کے مسائل عقائد سے تعلق نہیں رکھتے نہ فنا و بقا عقائد میں شامل ہیں بلکہ یہ صرف اصطلاحات ہیں جو عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کے نتائج بیان کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی کو ہر چیز کی جڑ ایک ہونے کے متعلق ہندوستان والوں کے کسی فلسفیانہ عقیدہ سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیہ الی اللہ مرجعکم جمیعًا۔ ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔
(ذوقی)

حجاب اٹھا دیا۔ زمانہ مابعد میں ایرانی صوفیوں کے نزدیک بایزید نے وہ اہمیت حاصل کی کہ ان کے شطحیات مثل "سبحانی" اور عالم رویا میں ان کے حصول معراج کے قصے بیان کرنے سے صوفی تھکتے ہی نہیں بعض اقوال جو بایزید سے منسوب کئے جاتے ہیں یہ ہیں۔

"اللہ کی ساری مخلوق احوال کے تحت میں ہے مگر عارف ان احوال سے مغلوب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے آثار سب مٹ جاتے ہیں، اس کی ذات کسی اور کی ذات میں، اور اس کی صفات کسی اور کی صفات میں فنا ہو جاتی ہیں۔"

"تیس برس ہوئے کہ خدائے برتر میرا آئینہ تھا۔ اب میں خود اپنا آئینہ ہوں یعنی جو کہ میں تھا وہ اب میں نہیں رہا کیونکہ "میں" اور "خدا" (کے الفاظ) توحید الٰہی کی نفی کرتے ہیں۔ چونکہ میں اب نہیں رہا خدائے برتر اب اپنا آپ ہی آئینہ ہے میں کہتا ہوں کہ میں آئینہ ہوں کیونکہ وہ حقیقتاً خدا ہے جو میری زبان سے گفتگو کرتا ہے اور میں درمیان سے اٹھ گیا ہوں۔"

"میں بایزیدی سے اس طرح نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے پھر میں نے دیکھا تو معلوم کیا کہ عاشق و معشوق و عشق ایک ہیں کیونکہ عالم توحید میں سب ایک ہیں۔"

بایزید اہل سکر کے محبوب پیشوا ہیں۔ برعکس اس کے اہل صحو جنید بغدادی کے متبع ہیں جن کا نظریۂ وصل ان کے شاگرد حلاج نے بیباکانہ حقیقت کے رنگ میں عملاً دنیا کے سامنے پیش کر دیا[1]۔ جب حلاج

---

[1] حسین منصور حلاج اٹھارہ سال کی عمر میں تستر آئے اور دو برس حضرت عبد اللہ تستری رحؒ کی صحبت میں رہے پھر آپ بصرہ تشریف لے گئے اور ڈیڑھ برس حضرت عمرو بن عثمان مکی رحؒ کی صحبت میں رہے۔ یہاں حضرت یعقوب اقطع رحؒ نے اپنی صاحبزادی کا عقد آپ کے ساتھ فرما دیا جب حضرت عمرو بن عثمان مکی رحؒ آپ سے ناراض ہو گئے تو آپ بغداد گئے اور حضرت جنید بغدادی رحؒ سے اپنے عمرو بن عثمان مکی رحؒ کی ناراضی کا سبب بیان کیا۔ حضرت جنید بغدادی رحؒ نے آپ کو خلوت اور سکوت کی تعلیم فرمائی۔ چند روز بعد آپ حجاز چلے گئے اور ایک سال وہاں قیام کر کے واپس بغداد آئے اور حضرت جنید بغدادی رحؒ سے کوئی سوال کیا حضرت کا جواب آپ نے نہ دیا اور فرمایا کہ تو بہت جلد لکڑی کا سر سرخ کرے گا یعنی سولی پر چڑھے گا۔ اس بات پر منصور حلاج ناراض ہو گئے اور تستر چلے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے۔ ان واقعات کی بنا پر پروفیسر نکلسن کا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحؒ

زندقہ کے سنگین الزام میں گرفتار کیے گئے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوئی اگر جنید نے ان سے برئیت کا اظہار کیا۔ ان کی کتاب الطواسین میں جو عقاید بیان کیے گئے ہیں وہ قطع نظر انا الحق کے بھی جو کہ اُن عقائد کا اشتعال انگیز خلاصہ ہے مسلمانوں کو مشتعل کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ مگر وہ عقائد اس درجہ انوکھے عمیق اور تاریکی اہمیت رکھنے والے ہیں کہ ان کے اہم اجزا کا خاکہ کھینچنے اور ان کے چند پہلوؤں کی جانب توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ صورت حال ہی میں ممکن ہو سکی ہے۔ کیونکہ پروفیسر میسگنن (Prof Massignon) نے حلاج کے اوراق پریشان کا پتہ چلا کر ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

بقول حلاج کے خدا نے جو کہ حقیقتاً عشق ہے انسان کو اپنی صورت پر اس غایت سے پیدا کیا کہ بندہ صرف خدا ہی سے محبت کرے اپنے اندر روحانی انقلاب پیدا کر کے خدا کے عکس کا اپنے میں شاہدہ کرے اور رضائے الٰہی اور فطرت کا تابع ہو کر واصل بالحق ہو جائے یہ ظاہر ہے کہ جس وصل کا حلاج ذکر کرتے ہیں اور جس کا انھیں خود تجربہ ہوا وہ حلولیوں کے ہمہ اوست سے کوئی سروکار نہیں رکھتا گو مسلم اور یورپین مصنفین نے ایسا ہی لکھا ہے۔ حلاج نے اپنے اظہار مطلب کی غرض سے حلول کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ اس کے ہم مذہبوں کے ذہن میں مظہریت کے عیسائی عقیدہ سے ملتبس ہو گئی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حلاج نے جہاں تک کہ ان کی ذات کا تعلق ہے اس اصطلاح کو اس معنی میں استعمال کیا ہو۔ مگر ان کے دوسرے عجیب و غریب اقوال ایسے ہیں جن کی رو سے مسلمان صوفیا میں انھیں سب سے زیادہ قریب روح مسیح سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ولی واصل باللہ کا مرتبہ پیغمبر سے جو کہ خلق کے ساتھ مشغول رہتا ہے بڑھا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا اعلیٰ نمونہ محمد (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے پیش نہیں کیا بلکہ عیسیٰ (علیہ السلام) نے پیش کیا جو کہ برگزیدہ انسانیت کا نمونہ تھے اور ہستی حق میں اپنے ظاہر و باطن سے فنا ہو کر مظہر حق و نمائندۂ الٰہی

بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ ... کے "نظریۂ وصل" کا اظہار بیباکی کے ساتھ حلاج نے کیا اور حضرت جنید رح نے اپنی جان بچانے کی غرض سے حلاج کی گرفتاری پر حلاج سے برئیت کا اظہار کر دیا۔

بن گئے تھے[1] حق تعالیٰ ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور وہ خالق سے ظاہر ہوتے تھے اور حقیقۃ الحقائق اُن پر محیط تھا۔ مزید براں پروفیسر میسگنن (Massignon) کے قول کے بموجب حلاج کا تمثیل وصل یہ ہے کہ بندہ واصل با مرکُن ہو جائے اور یہ لفظ کُن" قرآن میں ولادت مسیح اور قیامت سے متعلق کیا گیا ہے[2]۔ اس نوع کا وصل احکامات الٰہی کی صحیح تفہیم اور شدید پابندی پر موقوف ہے۔ اس نوع کی تفہیم اور پابندی کے مستقلاً حصول کے بعد صوفی کی روح میں خدا کی روح آجاتی ہے جو کہ امر رب (قرآن سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۵) کا کرشمہ ہے پھر اس کے بعد بندہ کا ہر فعل خدا کا فعل ہوتا ہے۔ حلاج نے سبق پڑھا تھا کہ تقدیس کی تکمیل بغیر مصائب اور ذاتی قربانی کے حاصل نہیں ہوتی اس سبق میں پختگی کا ثبوت دینے میں بھی انہوں نے کوتاہی نہ کی۔ ۹۲۲ء میں انھیں دار پر کھینچا گیا۔ جب انہیں صلیب کے پاس لایا گیا اور انہوں نے صلیب کی میخوں کو دیکھا تو لوگوں کی جانب رخ کرکے ایک دعا مانگی جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

---

[1] نہ معلوم حلاج نے کیا لکھا اور پروفیسر میسگنن یا نکلسن نے کیا سمجھ لیا کیونکہ حلاج کی اصلی تحریر اس وقت ہمارے سامنے نہیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں بڑوں بڑوں سے غلطی ہوئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ پیغمبر میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت حق یعنے وہ جہت جس سے وہ حق تعالیٰ سے متصل ہوتا ہے یا حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اخذ فیضان کرتا ہے۔ اور دوسری جہت خلق یعنی وہ جہت جس سے وہ خلق سے متصل ہوتا ہے یا خلق کی طرف متوجہ ہوکر خلق کی اصلاح کرتا ہے اور جو فیضان جہت اول کے ذریعہ اس نے حاصل کیا وہ خلق کو پہنچاتا ہے۔ جہت اول کو فضیلت دی جاتی ہے جہت ثانی پر کیونکہ توجہ الی الحق افضل ہے توجہ الی الخلق سے۔ توجہ الی الحق کو ولایت اور توجہ الی الخلق کو نبوت کہتے ہیں۔ ہر پیغمبر میں ولایت اور نبوت کا اجتماع لازمی ہے۔ اور اس کی ذاتی ولایت کو اس کی ذاتی نبوت پر فضیلت ہے جب صوفیا کی تحریروں میں اس نوع کی عبارت پائی جاتی ہے کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ ہر نبی کی ولایت کو اس کی نبوت پر شرف حاصل ہے۔ ورنہ یوں تو ہر نبی کو ہر ایسے ولی پر جو کہ نبی نہ ہو ہر اعتبار سے فضیلت حاصل ہے اور نبی آخر الزماں کو جملہ انبیاء پر ہر لحاظ سے فضیلت کلی حاصل ہے (ذوقی)

[2] اصل انگریزی کتاب میں عبارت کا یہ حصہ نہایت مہمل ہے۔ لفظ کُن تو پوری کائنات اور کائنات کی ہر چیز کی تخلیق سے متعلق ہے۔ ولادت مسیح اور قیامت کی تخصیص کے کیا معنی۔ (ذوقی)

"اور اے خدا! یہ لوگ جو مجھے قتل کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں تیرے ہی مذہب کی پرجوش حمایت اور تیری ہی خوشنودی کے حصول کی تمنا میں آئے ہیں۔ تو انھیں معاف فرما دے۔ اور ان پر اپنی رحمت نازل فرما۔ کیونکہ اگر تو نے ان پر وہ بات ظاہر کردی ہوتی جو بات کہ تو نے مجھ پر ظاہر کی ہے تو وہ اس کام کو نہ کرتے جس کام کو انہوں نے کیا۔ اور اگر تو نے مجھ سے وہ بات پوشیدہ رکھی ہوتی جو بات کہ تو نے ان سے پوشیدہ رکھی تو میں ان شدید مصائب میں مبتلا نہ ہوتا۔ تیری شان عظیم ہے۔ تو جو چاہے ارادہ فرمائے اور جو چاہے کرے۔ تجھے سب زیب دیتا ہے۔" (باقی)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

ضخامت (۵۰۰) صفحات۔ قیمت مجلد پانچ روپیہ انگریزی، پانچ روپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ۔ غیر مجلد چار روپیہ انگریزی، چار روپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن ۔۔۔۔ حیدرآباد دکن

مسودۂ ضابطہ تحفظ حقوق شرعیہ زوجین

مرتب کردہ مجلس علماء دکن

"رمضان ۱۳۵۲ھ کے ترجمان القرآن میں وہ مسودۂ قانون شائع کیا جا چکا ہے جو مولوی خلیل الزمان صاحب صدیقی بار ایٹ لانے حیدرآباد کی مجلس وضع آئین و قوانین میں "مسودۂ قانون حقوق ازدواج اہل اسلام" کے نام سے پیش کیا تھا۔ اب ذیل میں وہ مسودہ درج کیا جاتا ہے جو حیدرآباد کی مجلس علماء نے اس مقصد کے لیے مرتب کیا ہے۔" (ایڈیٹر)

تمہید ہرگاہ قرین مصلحت ہے کہ بعض امور مندرجۂ احکام شرع شریف متعلق حقوق زوجین کی مزید وضاحت وصراحت کردی جائے۔ لہٰذا حسب ذیل احکام شرعیہ بطور قانون سرکاری کے نفاذ کا حکم دیا جاتا ہے۔

مختصر نام و تاریخ نفاذ دفعہ ۱۔ یہ ضابطہ بنام تحفظ حقوق شرعیہ زوجین موسوم ہو سکے گا۔ اور تاریخ اشاعت جریدہ سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں نافذ ہوگا۔

ف۔ یہ ضابطہ ہر ایک مقدمہ یا کارروائی سے متعلق ہوگا جو تاریخ نفاذ ضابطۂ ہذا پر زیر تحقیقات یا نفاذ ضابطہ ہذا کے بعد دائر یا پیش ہو اور جس کا تعلق ازدواج اہل اسلام سے ہو۔

دعاوی فسخ نکاح و تفریق دفعہ ۲۔ جب کوئی دعویٰ فسخ نکاح یا تفریق کی غرض سے دائر کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ شرعیہ میں سے کسی ایک وجہ کا پایا جانا کافی متصور ہوگا۔

الف۔ شوہر کی مفقود الخبری۔

ب۔ شوہر کا زوجہ کے نفقہ کی ادائی نہ کرنا یا نہ کر سکنا۔

ج ۔ احد الزوجین کا عیوب مصرحۂ دفعہ (٦) میں سے کسی عیب میں مبتلا ہونا۔

د ۔ احد الزوجین کا نشوز ۔

ھ ۔ خیار بلوغ ۔

و ۔ لعان ۔

ز ۔ ارتداد احد الزوجین ۔

شوہر کی مفقود الخبری | دفعہ ۳ ۔ جب شوہر اپنے مکان سے چلا جائے اور لاپتہ ہو، اور اس نے اپنی زوجہ کے نان ونفقہ کا انتظام نہ کیا ہو اور زوجہ کی طرف سے دعویٰ تفریق پیش ہو تو محکمہ قضا ثبوت فقدان و عدم کفالت نان ونفقہ و عدم نشوز کے متعلق زوجہ مفقود سے حلف لینے کے بعد حسب ذیل مضمون کے تین اشتہارات ایک شایع کرے گا ۔

"چونکہ فلاں شخص اتنے عرصہ سے لاپتہ ہے اور اس نے اپنی زوجہ مسماۃ فلاں کی نہ خبرگیری کی اور نہ اس کے نان نفقہ کا کچھ انتظام کیا لہٰذا وہ جلد سے جلد اپنی قیام گاہ اور صحیح پتہ سے محکمۂ ہذا کو اطلاع دے اور اپنی زوجہ مسماۃ فلاں کی شکایت کے رفع کر دینے کا مناسب انتظام کر دے ورنہ حسب احکام مسلک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا۔"

توضیح ۔ مسلک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ ہے کہ اگر مفقود نے مال بقدر کفالت نان نفقہ چھوڑا ہو تو تاریخ ارجاع دعویٰ سے چار سال گزرنے کے بعد محکمہ قضا نکاح فسخ کر سکے گا ۔ اور عدم کفالت کی صورت میں فوراً فسخ کر سکے گا ۔

(۲) اعلانات مذکورہ جریدۂ اعلامیہ اور دوسرے اخبارات میں جن میں محکمۂ قضا مناسب سمجھے گا، شایع کیے جائیں گے ۔

(۳) مصارف اعلانات مذکورہ بشرط امکان شخص مذکور کی جائداد سے وصول کیے جائیں گے ورنہ

عورت بصورت استطاعت ادا کرے گی بصورت دیگر اشاعت کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا جائیگا۔

(۴) اگر یہ ثابت ہوگا کہ شخص مفقود نے مال بقدر کفالت زوجہ چھوڑا ہے تو محکمۂ قضا سے زوجہ مفقود کو تاریخ درخواست سے چار سال تک انتظار شوہر مفقود کا حکم دیا جائے گا۔

(۵) بصورت عدم ذرائع کفالت تاریخ اشتہار آخر سے تین ماہ گذرنے کے بعد اگر شخص مذکور کا پتہ نہ معلوم ہوگا تو محکمۂ قضا زوجین میں فسخ نکاح کا حکم جاری کرسکے گا۔

(۶) بصورت وجود ذرائع کفالت اگر چار سال کے بعد بھی شوہر کا پتہ نہ معلوم ہوگا تو محکمۂ قضا سے فسخ نکاح کا حکم صادر کیا جائیگا۔

(۷) بعد صدور فسخ نکاح و مرور ایام عدت چار ماہ دس یوم مدعیہ نکاح ثانی کر لینے کی مجاز ہوگی۔

(۸) اگر بعد فسخ نکاح و مرور ایام عدت اس عورت کا سابقہ شوہر واپس آئے اور اس عورت پر دعویٰ کرے تو ایسی صورت میں اس کا دعویٰ ناقابل سماعت ہوگا۔

عدم ادائی نفقہ دفعہ ۴۔ جس عورت کا شوہر اس کا نفقہ نہ دیتا ہو، خواہ بوجہ عدم استطاعت و ناداری (اعسار) نہ دے سکتا ہو، یا باوجود مقدرت و استطاعت نہ دیتا ہو، تو عورت کی طرف سے شکایت پیش ہونے پر شوہر کو ادائی نفقہ کے لیے محکمۂ قضا سے حکم میعادی ۳ ماہ دیا جائیگا۔ کہ فلاں تاریخ تک نفقہ ادا کردیا جائے بصورت عدم تعمیل نکاح فسخ کردیا جائے گا۔

دفعہ ۵۔ جس عورت کا شوہر چار سال یا اس سے زائد مدت کی سزا پاکر قید ہوگیا ہو اور اپنی زوجہ کے نفقہ کی کفالت نہ کرسکتا ہو اس کی حالت بھی عسر کی سمجھی جائے گی۔ اور فسخ نکاح کا حکم دیا جائیگا۔

عیوب احدالزوجین دفعہ ۶۔ جن عیوب سے احدالزوجین کو فسخ نکاح کا خیار حاصل ہوتا ہے وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عیوب جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ دوسرے وہ عیوب جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ عیوب جو عورتوں اور مردوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔

وہ عیوب جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں تین ہیں۔ جبّ[1]، عنّانہ[2]، خصاء[3]۔

وہ عیوب جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں چھ ہیں۔ رتق[4]، فتق[5]، قرن[6]، عفل[7]، استحاضہ[8]، قروح سیالہ (ذبح)

وہ عیوب جو مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں، تیرہ ہیں۔ یاسور۔ ناسور، برص، جذام، جنون

استطلاق بول، استطلاق غائط سل، وجار، خنثیٰ واضح، قرع راس جس میں بدبو ہو، بخر فم (ناقابل برداشت)

قروح خبیثہ، اندام نہانی۔

حق فسخ بصورت وجود عیب قبل نکاح | دفعہ۔ اگر احد الزوجین میں عیوب مذکورہ میں سے کوئی عیب قبل نکاح تھا اور بوقت نکاح فریق ثانی سے چھپایا گیا تھا تو فریق ثانی کو فسخ نکاح کا خیار رہوگا۔ عیب مرد میں ہونے کی صورت میں عورت کو مہر پانے کا حق ہوگا۔ اور عیب عورت میں ہونے کی صورت میں قبل خلوت صحیحہ فسخ ہو تو مہر ساقط ہوگا۔ اور بعد خلوت صحیحہ فسخ ہو تو مہر پانے کا حق ہوگا لیکن مرد مہر اس شخص سے حاصل کر سکے گا جس نے اسے دھوکہ دیا۔ اگر اس عیب کا علم سوائے اس عورت کے کسی کو نہ تھا تو وہ مہر پانے کی مستحق نہ ہوگی۔

استثناء۔ اگر قبل نکاح فریق ثانی کو اس عیب کا علم تھا تو حق خیار نہ ہوگا۔

حق فسخ بصورت حدوث عیب بعد نکاح | دفعہ۔ اگر بعد نکاح کوئی ناقابل برداشت عیب شوہر میں پیدا ہوا ہو اور زوجہ کی طرف سے تفریق کی استدعا پیش ہو تو شوہر کو علاج کے لیے ایک سال کے لیے مہلت دی جائے گی اگر اس مدت میں شوہر صحت یاب نہ ہو تو محکمۂ قضاء سے تفریق کرا دی جائے گی بشرطیکہ عورت زر مہر اور نفقہ عدت سے دست برداری لکھ دے۔

توضیح۔ اگر مرد کے متعلق عنین ہونے کی شکایت ہو تو عورت کے متعلق تحقیق کی جائے گی کہ وہ رتقاء و قرناء تو نہیں ہے۔ اگر رتقاء یا قرناء ہو تو مرد کا عنین ہونا ثابت نہ ہوگا۔

---

[1] مقطوع الذکر ہونا۔ [2] نامرد ہونا۔ [3] خصی ہونا۔ [4] اندام نہانی کی ایسی بستگی جو مانع جماع ہو۔ [5] عورت کا کشادہ فرج ہونا۔ یہ رتق کی ضد ہے۔ [6] قرن زن و آن چیز است کہ از فرج بیرون آید چوں شاخ۔ [7] و آن عیبی ست بزرگ شہ غلظ فی الرحم

(۲) مرد مجبوب ثابت ہونے کی صورت میں بلا مہلت تفریق کرا دی جائے گی اور خلوت صحیحہ ہو تو عورت کو مہر پانے کا بھی حق ہوگا۔

نشوز احد الزوجین | دفعہ ۹۔ حسب ذیل صورتوں میں احد الزوجین کا نشوز ثابت ہو سکے گا۔

الف۔ حسب ذیل صورتوں میں شوہر کا نشوز سمجھا جائے گا۔

(۱) جب کہ شوہر کو نکاح کی کسی ایسی شرط کے پورا کرنے سے قولاً یا فعلاً انکار ہو جس کی تکمیل زوجہ کا حق ہو۔

(۲) جب کہ شوہر بلا سبب زوجہ کی ہمبستری سے چار ماہ سے زیادہ عرصہ تک کنارہ کش رہے۔

(۳) جب کہ وہ متعدد زوجات رکھتا ہو اور سب میں حسب شرع عدل نہ کرے۔

(۴) جب کہ شوہر بلا سبب زوجہ کو مارا کرے یا آزار لسانی پہنچایا کرے۔

ب۔ حسب ذیل صورتوں میں زوجہ کا نشوز سمجھا جائے گا۔

(۱) جب کہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے چلی جائے۔

(۲) جب کہ عورت مدت گزر جانے کے بعد بھی شوہر کے گھر واپس نہ آئے۔

(۳) جب کہ عورت بدزبانی یا نافرمانی کیا کرے۔

(۴) جب کہ عورت نامحرم مردوں سے ایسا ربط پیدا کرے جو شوہر کی مرضی کے خلاف ہو۔

(۵) جب کہ عورت شوہر کے ساتھ ہمبستر ہونے سے بلا وجہ کنارہ کش ہو۔

توضیح۔ مرد کو اجازت ہے کہ عورت کو نصیحت کرے۔ اور نصیحت نہ ماننے تو تادیب کی حد تک سزا دے۔ اور اگر شوہر ان شرائط کا لحاظ نہ کرے تو اس کا نشوز سمجھا جائے گا۔

نشوز کی صورتوں میں تحکیم | دفعہ ۱۰۔ نشوز کی صورتوں میں جب دعوی دائر ہو تو تحت حکم الٰہی محکمہ قضا کو لازم ہوگا کہ مرد کے خاندان میں سے ایک شخص اور عورت کے خاندان میں سے ایک شخص کو حکم کے طور پر

زوجین سے نامزد کرائے اور زوجین کو لازم ہوگا کہ اپنی طرف کے حکم کو وکیل مطلق بنا دیں کہ وہ ان کی جانب سے جن شرائط پر چاہیں صلح کرلیں اور حکموں پر واجب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو صلح کرانے کی کوشش کریں بصورت عدم امکان وہ دونوں میں تفریق کرا سکتے ہیں۔ یا تفریق کرا دیں تحقیقات و گفتگوئے باہمی متعلق صلح میں اگر دونوں حکم کسی ایک صورت میں متحد ہو جائیں تو ان کے فیصلہ کو محکمۂ قضا نافذ کر دے گا۔ بصورت اختلاف حکمین و زوجین محکمۂ قضا خود تحقیقات کرے گا۔ اور قاضی کو اختیار ہوگا کہ حسب صوابدید وہ فسخ کر دے اور اگر ایسی صورت ہو کہ دونوں حکم تو کسی ایک فیصلہ پر متفق نہ ہوئے لیکن کسی ایک حکم کے فیصلہ پر زوجین راضی ہو گئے تو وہی فیصلہ نافذ ہوگا۔

عدم نفاذ نکاح صغیر | دفعہ ۱۱:- جب نکاح زمانۂ نابالغی میں باپ اور دادا کے سوا کسی اور شخص کی تولیت سے عمل میں آیا ہو تو نکاح اس وقت تک قابل نفاذ نہ ہوگا۔ جب تک کہ نابالغ سن بلوغ کو پہنچ کر نکاح قولاً یا فعلاً تسلیم نہ کرے۔

فسخ نکاح بصورت اب وجد | دفعہ ۱۲:- جب کسی شخص کی جانب سے جس کا نکاح باپ یا دادا نے زمانۂ نابالغی میں کیا ہو، دعویٰ بغرض فسخ نکاح و تفریق، سن بلوغ پر پہنچنے کے بعد بلا غیر ضروری تعویق پیش کیا جائے اور عدالت کی رائے میں ایسا نکاح باپ دادا نے خود غرضی یا بدنیتی سے کر دیا ہو تو عدالت دادرسی فسخ نکاح و تفریق عطا کر سکے گی بشرطیکہ دعویدار نے سن بلوغ کو پہنچکر قولاً یا فعلاً نکاح تسلیم نہ کر لیا ہو۔

فسخ نکاح بصورت لعان | دفعہ ۱۳:- اگر شوہر اپنی زوجہ پر زنا کا الزام لگائے اور ثبوت نہ دے سکتا ہو تو زوجین کو لعان کا حکم دیا جائے گا۔ اور لعان کے بعد عدالت فسخ نکاح کرا دے گی۔

ارتداد | دفعہ ۱۴:- احد الزوجین مرتد ہو جائے تو فسخ نکاح کا حکم دیا جائے گا:-

اطلاع:- عدم ادائی نفقہ و نشوز مرد کی صورت میں مثل نہ ادا کرنے والے قرض داروں کے مناسب مدت تک شوہر کو حبس کیا جائیگا۔ جب اس کی شرارت بالکل واضح ہو جائے تو حسب قاعدہ فسخ نکاح کر دیا جائے گا۔

نوٹ۔ چونکہ نکاح و طلاق خالص مذہبی امور ہیں لہذا حاکم فسخ کنندۂ نکاح، ضرور ہے کہ مسلم ہو کیونکہ مسلم پر غیر مسلم کا ایسا حکم نافذ نہ ہوگا۔ اور زوجہ کو دوسرے سے نکاح کرنے کا حق پیدا نہ ہوگا کیونکہ مسلم قاضی کا حکم ظاہراً اور باطناً نافذ ہوتا ہے۔ اور غیر مسلم کا نافذ نہیں ہوتا پس اگر غیر مسلم نے فسخ نکاح کا حکم کر دیا اور عورت نے دوسرے سے نکاح کیا تو وہ مرتکب زنا سمجھی جائے گی۔

نوٹ۔ محکمہ امور مذہبی و صدارت العالیہ سے مدد لے کر کابین نامہ میں ایک خانہ زیادہ کر کے دولہا دولھن کے دستخط لیے جائیں۔ اور اس خانہ میں عبارت ذیل درج ہو۔

"اگر ہم قانون ازدواج اہل اسلام کی خلاف ورزی کریں تو حَکَم یا حاکم دار القضاء کو [illegible] اپنا وکیل بناتے ہیں۔ لہذا شوہر کی طرف سے تفویض طلاق اور بیوی کی طرف سے معافی مہر کا حق حَکَم اور حاکم قضاء کو منتقل کیا جاتا ہے۔"

چونکہ شرائط نکاح کی پابندی زوجین پر لازم ہے اور وکیل کا فعل عین مؤکل کا فعل ہوتا ہے لہذا حکم حَکَم و حاکم ناطق ہوگا اور اس سے علمائے احناف کا اختلاف باقی نہ رہے گا۔

نوٹ۔ دونوں کے نکاح کے لئے جب قاضی کا تقرر سرکار سے ہوتا ہے، اگر مفقود الخبر کیلئے ایک مالکی قاضی کا اور دیگر بعض مسائل کیلئے حنبلی قاضی کا تقرر کیا جائے تو اس کا فیصلہ ناطق ہوگا اجتہاد امام حاکم کے فیصلہ سے احناف کو اختلاف نہ ہوگا۔ کیونکہ حنفی مقلد محض قاضی اپنے امام کے مذہب کے خلاف فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اور دیگر مذاہب والوں کو خالص مذہبی امور کے فیصلہ کا حق نہیں ہے۔

فقیر محمد بادشاہ حسینی القادری معتمد مجلس علماء، دکن۔

حقوق الزوجین

ضابطۂ تحفظ حقوق شرعیۂ زوجین پر ایک نظر

ہر قوم کے تمدن کی شیرازہ بندی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا جامع قانون جس میں اس کے مخصوص طرز تمدن کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو۔ دوسرے ایک ایسی ہیئت حاکمہ جو اس قانون کو ٹھیک اسی اسپرٹ میں نافذ کرنے والی ہو جس میں وہ وضع کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمان اس وقت ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ بلاشبہ ان کے پاس کتابوں میں لکھا ہوا ایک قانون ضرور موجود ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہے اور تمدن و معاشرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، مگر وہ قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے، اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون ان کے تمدنی معاملات پر فرمانروائی کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیۃً غیر اسلامی ہے، اور بعض معاملات میں اگر اسلامی ہے بھی تو ادھورا۔ مسلمان اس وقت جس ہیئت حاکمہ کے تابع ہیں اس نے عملاً ان کی تمدنی زندگی کو دو شعبوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شعبہ وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی ایسے قوانین نافذ کر دیے ہیں جو اسلامی تمدن کے مزاج سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتے۔ دوسرا شعبہ وہ ہے جس میں اس نے اصولاً مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔ مگر عملاً اس شعبہ میں بھی شرع اسلامی کا نفاذ صحیح طریق پر نہیں کیا جاتا۔ محمڈن لاء کے نام سے جس قانون کو اس شعبہ میں نافذ کیا گیا ہے وہ اپنی شکل اور روح دونوں میں اصل اسلامی شریعت سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کے نفاذ کو صحیح معنوں میں شرع اسلامی کا نفاذ نہیں کہا جا سکتا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں ان میں سب سے زیادہ
اہم نقصان وہ ہے جس نے ہمارے کم از کم ۷۵ فی صدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی
کے ایک بڑے حصہ کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی
تمدن کا سنگ بنیاد ہے، اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد اُس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا
جو اس تعلق کو منضبط کرنے کے لیے بنایا گیا ہو، کیونکہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصہ میں یہ قانون
کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات
اس کی تربیت میں مؤثر ہوں گے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریک زندگی سے واسطہ پڑیگا اگر
سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات کی بندشوں میں بندھے گی اور اس کے قلب و روح
کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک ان تعلقات کی بہتری پر منحصر ہوگا۔ غرض قانون ازدواج
ایک ایسا قانون ہے جو قوانین تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے اسلام میں
اس قانون کی حقیقی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر اس کی تدوین نہایت صحیح اصولوں پر کی گئی تھی، اور مسلمانوں
کو ازدواجی معاملات میں اپنے مذہب سے ایک ایسا مصلح، جامع اور مکمل قانون ملا تھا جس کو دنیا کے تمام قوانین
ازدواج میں ہر حیثیت سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔ مگر شومی قسمت سے یہ قانون بھی "محمڈن لا" کی مصیبت میں
آگیا اور اس بری طرح مسخ ہوا کہ اس میں اور اصل اسلامی قانون ازدواج میں ایک بہت ہی دور کی
مشابہت باقی رہ گئی ہے۔ اب شرع اسلامی کے نام سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو قانون نافذ
ہے وہ نہ مصلح ہے، نہ جامع، نہ مکمل۔ اس کے نقائص نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی پر اتنا برا اثر ڈالا ہے کہ
شاید کسی دوسرے قانون سے نہیں پڑا۔ مشکل ہی سے ہندوستان میں کوئی ایسا خوش قسمت خاندان مل
سکے گا جس میں اس ناقص قانون کی بدولت کوئی زندگی تباہ نہ ہوئی ہو۔ زندگیوں کا تباہ ہونا تو پھر
بھی ایک امر حقیر ہے، اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس قانون کی خرابی نے بکثرت مسلمانوں کی عزت و آبرو

تباہ کیا، ان کے اخلاق اور ایمان کو برباد کر ڈالا، اور جو گھران کے دین اور ان کی تہذیب کے محفوظ ترین قلعے تھے ان میں بھی فواحش اور ارتداد کے سیلاب کو پہنچا دیا۔

قانون اور اس کو نافذ کرنے والی مشین کے نقائص سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان پر مزید خرابیوں کا اضافہ دو وجوہ سے ہوا۔ ایک دینی تعلیم و تربیت کا فقدان، جس کی بدولت مسلمان اسلام کے قانون ازدواج سے اس حد تک بیگانہ ہو گئے کہ آج اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمی اس قانون کے معمولی مسائل تک سے ناواقف ہیں تفصیلات تو درکنار اس کے اصول تک کو جاننے اور سمجھنے والے مسلمان بہت کم ملیں گے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کے معاملاتِ نکاح و طلاق کا تصفیہ کرتے ہیں، اسلامی قانونِ ازدواج کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ اس عام جہالت نے مسلمانوں کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ وہ بطورِ خود اپنے ازدواجی تعلقات میں اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک اتباع کر سکیں۔ رہی دوسری وجہ تو وہ غیر اسلامی تمدنوں کا اثر ہے جس کی بدولت مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات میں نہ صرف بہت سے ایسے رسمیات اور وہمیات داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی قانون ازدواج کے اصول اور اس کی اسپرٹ کے خلاف ہیں، بلکہ سرے سے زوجیت کا اسلامی تصور ہی ان کی ایک بڑی اکثریت کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ کہیں ہندو تصور غالب آ گیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ بیوی کو لونڈی اور شوہر کو آقا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ نکاح کی بندش اعتقاداً نہیں تو عملاً ناقابلِ فسخ ہے۔ طلاق اور خلع اس قدر معیوب ہو گئے ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں بھی ان سے محض اس بنا پر احتراز کیا جاتا ہے کہ کہیں ناک نہ کٹ جائے، خواہ درپردہ وہ سب کچھ کیا جائے جو درحقیقت طلاق اور خلع سے زیادہ بدتر ہے۔ طلاق کو روکنے کے لیے مہر کی مقدار اس قدر بڑھا دی گئی ہے کہ شوہر کبھی طلاق دینے کی جرأت نہ کر سکے، اور منافرت کی صورت میں عورت کو معلق رکھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ "شوہر پرستی" عورت کے مفاخر اور اخلاقی فرائض میں داخل ہو گئی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ محض سوسائٹی کی لعنت و ملامت کے خوف سے طلاق یا خلع کا نام زبان پر نہیں لا سکتی حتیٰ کہ اگر شوہر مر جائے تب بھی

اس کا اخلاقی فرض یہ ہوگیا ہے کہ ہندو عورتوں کی طرح اس کے نام پر بیٹھی رہے۔ کیونکہ بیوہ کا نکاح ثانی کرنا نہ صرف اس کے لیے بلکہ اس کے سارے خاندان کے لیے موجب ذلت ہے۔ دوسری طرف جو نئی نسلیں فرنگی تہذیب سے متاثر ہوئی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو بڑے زور سے کہتے ہیں مگر لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ پر پہنچ کر دفعتہً ان کی آواز دب جاتی ہے اور جب اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کا فقرہ ان کے سامنے آتا ہے تو ان کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح اس آیۃ کو قرآن سے خارج کر دیں۔ عجیب عجیب طریقہ سے اس کی تاویلیں کرتے ہیں، اور تاویل کا انداز کہے دیتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر سخت شرمندہ ہیں کہ ان کے مذہب کی مقدس کتاب میں یہ آیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فرنگی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو صور پھونکا ہے اس سے وہ دہشت زدہ ہوگئے ہیں۔ اور ان کے دماغوں میں ان ٹھوس اور محکم عقلی اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے جن پر اسلام نے اپنے نظام معاشرت کو قائم کیا ہے۔

ان مختلف اسباب نے مل جل کر مسلمانوں کی حیات عائلی کو اتنا ہی بدتر کر دیا ہے جتنی وہ کسی زمانہ میں بہتر تھی۔ جہالت اور اجنبی تمدنوں کے اثر سے ان کے ازدواجی معاملات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو سلجھانے سے موجودہ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والی مشین سراسر قاصر ہے، بلکہ اس کے قصور نے ان پیچیدگیوں پر بہت سی مزید الجھنوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ان تمام خرابیوں کی وجہ اسلامی قانون کا نقص ہے، اسی لیے ایک نئے قانون کی تدوین پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام میں ایک ایسا مکمل ازدواجی قانون موجود ہے جس میں زوجین کے لیے انصاف کے ساتھ واضح حقوق متعین کئے گئے ہیں۔ ان حقوق کی حفاظت اور تعدی کی صورت میں (خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے) دادرسی کا پورا انتظام کیا گیا ہے، اور کوئی ایسی پیچیدگی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کو عدل کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔ لہٰذا مسلمانوں

کو کسی نئے قانون کی ضرورت ہی نہیں۔ اصلی ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج اپنی صحیح صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام تنہا حکومت کے کرنے کا نہیں ہے۔ سب سے پہلے علماء کا فرض ہے کہ تقلید جامد کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام کے قانون ازدواج کو ایسی صورت میں پیش کریں کہ مسلمانوں کے ازدواجی مسائل کی موجودہ پیچیدگیوں کو پوری طرح حل کیا جاسکے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے نظام معاشرت کو ان جاہلانہ رسموں اور ان جاہلی تصورات سے پاک کردیں جن کو انہوں نے غیر اسلامی تمدن سے اخذ کیا ہے، اور اسلامی قانون کے اصول اور اسپرٹ کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے معاملات انجام دیں۔ پھر یہ حکومت کا فرض ہے کہ اسلام کا جو قانون خود مسلمانوں کی طرف سے اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کو (Personailaw) کی حیثیت سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں نافذ کرے، اور اس محمڈن لا کی پابندی چھوڑ دے جو فقہ کی بعض کتابوں کے ناقص اقتباسات اور فیصلوں کے غلط نظائر سے ایک قانون بن گیا ہے۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھا جارہا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسلامی قانون ازدواج کا ایک پورا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اس قانون کے مقاصد، اصول اور احکام، سب جزئیات اپنے اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ حسب ضرورت ہم تشریح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے فیصلوں کی نظیریں اور ائمہ سلف کی اجتہادی آراء بھی نقل کریں گے تاکہ ان سے جزئی مسائل مستنبط کرنے میں آسانی ہو۔ آخر میں چند ایسی تجویزیں پیش کی جائیں گی جن سے اصول شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی موجودہ الجھنیں دور ہوسکتی ہیں۔

قانون ازدواج کے مقاصد کسی قانون کو اس کی اصلی اسپرٹ میں نافذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان مقاصد کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے جن کے لیے وہ قانون بنایا گیا ہے۔ کیونکہ قانون میں سب سے

اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لیے اصول مقرر کیے جاتے ہیں۔ اور ان اصول کے ماتحت احکام دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھے بغیر احکام نافذ کرے گا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزئی مسئلہ میں وہ ایسا حکم نافذ کر دے جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہوگا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہٰذا ہم پہلے ان مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لیے اسلام میں ازدواجی معاملات کے لیے قانون مقرر کیا گیا ہے۔

اخلاق و عفت کی صیانت اسلامی قانون ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حصن قلعے کو کہتے ہیں، اور احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ محصِن ہے۔ گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصَنہ ہے۔ یعنی وہ اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانون ازدواج کا پہلا کام اس قلعہ کو مستحکم کرنا ہے جو نکاح کی صورت میں اس گران قدر چیز کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ۔

اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (۴:۴) ۔	جو عورتیں تم پر حرام کی گئی ہیں ان کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لیے نہیں بلکہ قید نکاح میں لانے کے لیے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

پھر عورتوں کے لیے کہتا ہے۔

فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا	پس تم ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرو اور قاعدہ و احسان کے ساتھ ان کے مہر ادا کر

مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۔ (۴:۲۵) ۔

تاکہ وہ محصنات بنیں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے ۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ... وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَا اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ (۵:۵)

آج تمہارے لیے تمام پاک چیزیں حلال کی گئیں ... اور باعفت عورتیں خواہ وہ مومن ہوں یا اہل کتاب میں سے بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کرکے قید نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات پیدا کرنے والے

ان آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق میں احصان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لئے ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے، مگر کسی دوسری چیز کے لیے اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا ۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لیے مقید کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کریں لیکن اگر کسی قید نکاح میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو، تو بجائے اس کے کہ نکاح کی ظاہری قید کو برقرار رکھنے کے لیے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر ایسی قید نکاح کو قربان کر دیا جائے۔ اسی لیے ایلاء کرنے والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ چار مہینہ سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں، اور اگر وہ چار مہینے کی مدت گزرنے پر بھی رجوع نہ کریں تو انہیں ایسی عورت کو قید نکاح میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس سے وہ ہم بستر نہیں ہونا چاہتے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت اپنے داعیات فطرت کو پورا کرنے کے لیے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو گی جس کو اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ

وَلَا تَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَۃِ ۔ یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری عورت گویا معلق رہ جائے ۔ اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ عورت کو ایسی حالت میں مبتلا نہ کیا جائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو ایسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رہنے سے بہتر ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو جائے ۔ پھر عورت کو خلع کا حق بھی اسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے ۔ ایک عورت کا کسی ایسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش نہ ہو ، یا جس سے اس کو نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو ، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیتا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے ۔ اس لیے ایسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اس کا مال (جو مہر کی صورت میں اسے ملا تھا) یا اس سے کم زیادہ دے کر قید نکاح سے رہائی حاصل کر لے ۔ قانون اسلامی کی ان دفعات کو آگے چل کر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا ۔ مگر یہاں ان مثالوں کے بیان کرنے سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی قانون نے اخلاق و عفت کی حفاظت کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دی ہے ۔ اور اگرچہ وہ قید نکاح کو حتی الامکان ہر طریقہ سے مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جہاں اس قید کے برقرار رہنے سے اخلاق و عفت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو ، وہاں وہ اس متاع گراں مایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کو کھول دینا ضروری سمجھتا ہے ۔ اسلامی قانون کی جو دفعات آئندہ بیان کی جائیں گی ان کو سمجھنے اور ان کو قانون کی حقیقی اسپرٹ کے مطابق نافذ کرنے کے لیے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے ۔

مودت و رحمت دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازدواج کا تعلق مودت و رحمت کی بنیاد پر ہو تاکہ مناکحت سے تمدن و تہذیب کے جو مقاصد متعلق ہیں ان کو وہ اپنے اشتراک عمل سے بدرجہ اتم پورا کر سکیں اور ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت مسرت اور سکون و آرام حاصل ہو سکے جس کا حصول انہیں تمدن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے ۔ قرآن مجید میں اس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زوجین کا باہمی

مودت و رحمت ہے، اور زوجین بنائے ہی اس لیئے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:-

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ (۳۰:۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (۷:۱۸۹)

وہی ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور اس کے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

پھر ایک دوسرے پیرایہ میں زوجیت کے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے:-

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲:۱۸۷) وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

یہاں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ لباس وہ چیز ہے جو انسان کے جسم سے متصل رہتی ہے، اس کی ستر پوشی کرتی ہے، اور اس کو خارجی فضا کے مضر اثرات سے بچاتی ہے اس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لئے استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے ویسا ہی تعلق ہونا چاہیے جیسا کہ جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے دل اور ان کی روحیں ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہوں وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کریں۔ اور ایک دوسرے کو ان اثرات سے بچائیں جو ان کی عزت اور ان کے اخلاق پر حرف لانے والے ہوں یہی مقتضیٰ ہے مودت و رحمت کا اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصلی روح ہے۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ روح نہیں ہے تو گویا وہ ایک لاشہ

بے جان ہے ۔

اسلام میں ازدواجی تعلقات کے لیے جو قوانین مقرر کیے گئے ہیں ان سب میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین اگر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو صلح و آشتی، محبت اور دلی یکجہتی کے ساتھ رہیں، ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، اور آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں لیکن اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو پھر ان کی یکجائی سے جدائی بہتر ہے۔ کیونکہ مودت و رحمت کی روح نکلنے کے بعد ازدواجی تعلق ایک مردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفونت پیدا ہوگی۔ اور اس سے خانگی زندگی کی ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ :-

وَإِن تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۔ (۴:۱۹) ۔

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے اور زوجین ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانۂ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرنے والا ہے۔

پھر جگہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۲:۲۹

یا تو نیکی کے ساتھ ان کو اپنے پاس رکھا جائے یا احسان (نیک برتاؤ) کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۔ (۶۵:۱)

یا تو نیکی کے ساتھ ان کو اپنے پاس رکھو یا نیکی کے ساتھ ان سے جدا ہو جاؤ۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۴ : ۳)

اپنی بیویوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا

یا تو نیکی کے ساتھ ان کو پاس رکھو یا نیکی کے ساتھ رخصت کر دو محض ستانے کے لیے ان کو نہ روک رکھو کہ ان کی

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۲ : ۲۳۱)

حق تلفی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر خود ظلم کریگا (یعنی اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنائیگا)

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (۲ : ۲۳۷) ۔

اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو (یعنی فیاضی کا برتاؤ کرو) ۔

طلاق رجعی کے احکام جہاں بیان کیے گئے ہیں وہاں رجوع کے لیے نیک نیتی کی شرط لگا دی گئی ہے یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو حق ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کرے مگر شرط یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی ہو، نہ کہ ستانے اور لٹکائے رکھنے کی وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (۲ : ۲۲۸)

پھر ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جو اپنے مذہب اپنے خیالات اور تمدن و معاشرت میں مسلمانوں سے اتنی مختلف ہیں کہ مسلمان دلی محبت اور قلب و روح کی یکجہتی کے ساتھ ان سے میل نہیں کھا سکتے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ازدواج کا رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا، بلکہ محض ایک شہوانی رشتہ بن جائے گا، اور اس میں یا تو مودت و رحمت نہ ہوگی۔ یا اگر ہوگی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے مفید ہونے کے بجائے مضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (۲ : ۲۲۱)

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔ اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اگرچہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے

کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے لیکن اس کو بھی اسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمایا، اور ممانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اِنَّھَا لَا تُحْصِنُکَ، وہ تجھے محصن نہیں بنا سکتی، کیونکہ تیرے اور اس کے درمیان مودت و رحمت نہ ہوگی جو احصان کی اصلی روح ہے۔ حضرت حذیفہ نے ایک یہودیہ سے نکاح کرنا چاہا، تو حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے کتابیات سے نکاح کو بصراحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علیؓ نے کراہیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کرسکتا جو خدا اور اس کے رسول کے مخالف ہوں، اور جب زوجین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نکاح کس کام کا۔

غرض مندرجۂ بالا مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانت اخلاق و عصمت کے بعد دوسری چیز جو اسلام کے قانون ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زوجین کے درمیان مودت و رحمت ہے جب تک ان کے تعلقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی امید ہو، اسلامی قانون ان کے رشتۂ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے، اور جب یہ مودت و رحمت باقی نہ رہے، اور اس کی جگہ بے دلی، سرد مہری، نفرت، اور بیزاری پیدا ہو جائے، تو قانون کا میلان رشتۂ نکاح کی گرہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اس قابل ہے کہ اس کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ کیونکہ جو لوگ اس کو نظر انداز کر کے قانون اسلامی کے اصول کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں، وہ قدم قدم پر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ اخلاص

از جناب مولٰنا عبد القدیر صدیقی

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ وہ اللہ ہے ایک ہے ۔

کفار نے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ تمہارا خدا کیا ہے ؟ اس کے صفات کیا ہیں ؟ اس پر یہ سورت اتری ۔

ھو ۔ وہ ۔ صرف اس کے لفظ پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ پہلا حرف ہ ہے جو انتہائے حلق سے نکلتا ہے اور دوسرا حرف واو ہے جو شفوی ہے ، ہونٹوں سے نکلتا ہے ۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ ابتدا و انتہا سب کو محیط ہے ، کوئی شئے اس سے خارج نہیں ۔

چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں ۔ واجب ممکن ۔ واجب جس کا ہونا ضرور ہو ۔ ممکن جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوں ۔ اصلی اور بالذات (وہ) تو واجب الوجود ہے ممکن کے ساتھ اگر واجب سے مخلوق ہونے کا لحاظ نہ کیا جائے تو (وہ) کب رہتا ہے ۔ کو بھی پھرتی ہے مگر جب کہ اس کے ساتھ ہاتھ کی قوت لگی ہوی ہو ۔ ورنہ وہ بالطبع ساکن ہے ، بے حرکت ہے ۔

اصلی (وہ) ، تو سب کے آخر میں ہوگا ۔ سب کا منتہا ہوگا ۔ درمیان میں وسائط ہیں بعلت بعید جو آخر کا (وہ) ہے ۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو روتا ہے ، منہ کھول کھول کر چوطرف پھرتا ہے ۔ جانتا ہے کہ کوئی ہے جو میرے کام آئے گا ، میری فریاد سنے گا مجھے دودھ دے گا ۔ جیسا جیسا بڑا ہوتا جاتا ہے ، ماں کو

دایہ کو رازق سمجھتا ہے۔ اور بڑا ہوتا ہے تو باپ کو رب سمجھتا ہے اور بڑا ہوتا ہے تو بادشاہ کیطرف توجہ کرتا ہے پھر عناصر پھر ستاروں کو اپنا محتاج الیہ جانتا ہے
یہاں تک کہ آخر میں تمام عالم کے محتاج الیہ سارے جہان کے معبود کیطرف رجوع کرتا ہے ہر قدم پر ایک کو معبود یا محتاج الیہ متعین کرتا
ہے۔ اس تعین میں خطا کرتا ہے معبود کی طلب فطری ہے تعیین عقلی ہے جس میں غلطی نکلتی ہے جب تمام تعینات
سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے تو اصلی اور حقیقی معبود کی طرف راہ نکل آتی ہے سمجھتا ہے۔ کیا سمجھتا ہے؟ یہی یک وہ
ہے۔ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ یہی وہ ہے "ہے" کا لفظ وجود پر دلالت ہے۔ وجود کیا ذہنی و عقلی بات ہے؟
نہیں، ذہنی و عقلی وجود سے ہماری اصلی غرض متعلق نہیں۔ ذہنی وجود ہمارے کس کام کا بے شک
کوئی نفس الامر اور خارج میں ہے ذہنی وجود نفس الامری سے خبر دیتا ہے۔ اس کو صوفی ما بہ الموجودیت
کہتے ہیں۔ وہ اگر نہ ہو تو سب جھوٹ ہوں من گھڑت ہوں خیالی پلاؤ ہوں جن کے لذ وہوں۔ اسی
ما بہ الموجودیت جھوٹ سچ، صدق و کذب کا دار و مدار ہے۔ واقعہ کچھ بھی نہ ہو اور خبر دی جائے تو یقیناً خبر
جھوٹی ہوگی۔ جو خبر واقعہ کے مطابق ہو، لاریب حق ہے، سچ ہے۔ آؤ ذرا غور کریں۔ زید ہے۔ عمرو ہے
گھوڑا ہے آم کا درخت ہے، سنگ مرمر ہے۔ فرشتہ ہے۔ ان سب میں کیا "ہے" کے معنی ایک ہی ہیں
یا ہر جگہ جدا معنی ہے؟ سب جگہ ہے کے معنی ایک ہیں۔ زید عمرو، گھوڑے، آم کے درخت، سنگ مرمر اور
فرشتہ کو "ہے" سے ربط ہے۔ اگر "ہے" سے ربط نہ ہو تو نہ آم پائے جائیں نہ جام سب خالی چیزیں، دنیا
واقعیت سے کوسوں دور۔ نہ ان پر آثار مترتب ہوں، نہ احکام خارجی لگائے جا سکیں جب لفظ "ہے" تمام جگہوں
میں ایک ہی معنی کے ساتھ ہے تو اس کا منشا بھی سب میں ایک ہی ہوگا۔ وہ کیا ہوگا؟ وہ "ہے" کا منشا ہوگا
ما بہ الموجودیت ہوگا۔ اب ہم آئندہ "ہے" کی جگہ ہستی اور ما بہ الموجودیت، وجود یا وجود حقیقی لکھیں گے۔

کیا اس وجود سے پہلے کچھ ہوگا؟ "ہوگا" تو بتلا رہا ہے کہ وجود ہی ہوگا۔ کیا اس وجود کے بعد کچھ بچا
رہے گا "بتلا رہا ہے کہ وجود ہی رہے گا۔

وجود تو ایک ہی شئے ہے۔ وجود سے پہلے وجود، یا وجود کے بعد وجود مہمل بات ہے۔ لہٰذا وجود ازلی

ابدی ہے۔ کیا وجود کے مقابل کچھ ہے؟ "مثبت" بتلا رہا ہے کہ وجود ہی ہے۔ وجود کے مقابل وجود بھی مہمل بات ہے۔ وجود کے مقابل کچھ ہو سکتا ہے تو عدم ہو سکتا ہے۔ عدم اور ہوتا! توبہ توبہ۔ مہمل، بالکل مہمل۔

کیا وجود حقیقی کسی کا محتاج ہے؟ نہیں۔ سب وجود حقیقی کے محتاج ہیں۔ ترتب آثار میں، جریانِ احکام میں، ہونے میں حقیقی شئے بننے میں۔

وجود بسیط اور واحد ہے یا مرکب اور اجزا والا ہے؟ کل جز کا محتاج ہوتا ہے۔ اجزا کل سے پہلے ہوتے ہیں۔ وجود سب کا محتاج الیہ ہے۔ سب سے اس کا رتبہ مقدم ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو شئے بسیط محض ہو وہ یا تو اجلی بدیہات سے ہوتی ہے، یا مایوس عن النظر ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں حقیقت حقہ ناقابل ادراک ہونے کے باوجود اجلی البدیہات سے ہے۔

سب میں شک ہو تو ہو، مگر وجود ایسا یقینی و قطعی امر ہے کہ اس میں کسی کو شک نہ ہونا چاہیے ہاں اس کو جتنا بیان کرنا چاہوگے وہ چھپتا ہی جائے گا۔ کیونکہ تمام معانی اس سے اخص اور اس سے مخفی تر ہیں۔ وجود ہی سب سے عام اور اجلیٰ ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جس کی حقیقت بیان نہیں ہو سکتی اس کی تعریف لوازم سے ہوگی خواہ اضافیات سے خواہ سلبیات سے۔ لہذا ذات حقہ کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ سب کا محتاج الیہ اور نقائص سے پاک ہے مجمع جمیع صفات کمالیہ ہے۔ سب کی علت ہے کسی کا معلول نہیں۔ ان تمام معانی پر لفظ اللہ دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے فرمایا ہُوَ اللّٰہُ احد۔ چونکہ ذات حقہ بالکل واحد ہے، بالکل بسیط ہے، لہذا اس کی تعریف الوہیت سے زیادہ کسی اور لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ اِلٰہ بمعنی مالوہ۔ یعنی معبود ہے تالّہ بمعنی تعبد (بندگی) سے ماخوذ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں وہ ذات جس کی طرف بے قرار ہو کر دوڑیں یہ ماخوذ ہے اَلِہَ الفصیل الی امہ سے۔ یعنی اونٹنی کا بچہ بے قرار ہو کر اپنی ماں کی طرف دوڑا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں وہ ذات جس میں حیرانی ہو۔ یہ ماخوذ ہے تالہ یعنی تحیر سے۔ بعض کا یہ کہنا کہ لاہ یا

اس سے قریب المخرج لفظ کسی اور زبان میں ایک بت کا نام تھا۔ اس سے یہ لفظ عربی میں آیا محض لغو ہے۔ خدا کا خیال جاہل، عالم، متمدن، غیر متمدن، سب اقوام میں ہے۔ ضروری اور اصولی الفاظ غیر زبان سے نہیں لیئے جاتے، بلکہ واضع زبان ہی اس کو وضع کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ علمی ترقی کے ساتھ معنی و مفہوم میں کچھ تغیر ہوتا گیا ہو۔ مگر اس کا اشتقاق تو ناقابل انکار اور دل کو لگتا ہے۔

اللہ پر الف لام لگایا گیا الالہ ہوا۔ الف تخفیفاً گرا دیا گیا۔ اور لام میں مدغم ہوا۔ اللہ ہوا۔ اب لفظ اللہ خدائے تعالیٰ کا علم اور شخصی نام ہو گیا ہے چنانچہ کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ سے بھی علمیت معلوم ہوتی ہے، جس سے توحید شخصی کا اثبات ہوتا ہے۔

اَحَدٌ۔ واحد، ایک، احد، بالکل ایک۔ احد مرتبۂ ذات پر دلالت کرتا ہے جو ناقابل تقسیم ہے اس سے معلوم ہوا کہ نہ اس کے اجزاء بالقوہ ہیں نہ بالفعل، نہ اجزاء عقلیہ ہیں، نہ اجزاء خارجیہ۔ وہ ایک ہے اور بالکل ایک، سراسر ایک۔ نہ اس کی جنس ہے نہ فصل۔ نہ اس کے ٹکڑے اور اعضاء ہیں۔ اس کی ذات مقدسہ میں کثرت کو دخل ہی نہیں جب وہ احد ہے، کثرت کو اس کی ذات میں دخل ہی نہیں، تو خدا اور غیر خدا میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ پھر کدھر اس کے ماں باپ، کہاں جورو بچے یا کوئی برابر والا

صوفیۂ صافیہ کی اصطلاح میں وجود حقہ کے چار اعتبار ہیں:۔

احدیت، سب سے پاک، ذات محض۔

وحدت، قابلیت کثرت۔ ان قابلیات کو شئون کہتے ہیں۔

واحدیت، مرتبۂ صفات۔

وحدت مطلقہ۔ ان تینوں اعتبارات سے عام اعتبار۔

ہو الاول والآخر والظاہر والباطن کو دیکھو۔ اول احدیت پر دلالت کرتا ہے۔ آخر وحدت پر ۔۔ ہو وحدت مطلقہ پر۔ اسی طرح الظاہر واحدیت پر دلالت کرتا ہے۔ الباطن احدیت پر۔ اور ہو

وحدت مطلقہ پر۔ وحدت میں شئون دو قسم کے ہیں شئون الٰہیہ شئون خلقیہ۔ یا یوں کہو کہ شئون مؤثرہ شئون متاثرہ۔ واحدیت میں معلومات کو اعیان ثابتہ کہتے ہیں۔ اعیان بھی دو قسم کے ہیں۔ اعیان الٰہیہ مؤثرہ۔ اعیان کونیہ یا مخلوقہ یا متاثرہ۔ دنیا کا سارا متندان اعیان کونیہ پر اعیان الٰہیہ کی تجلی سے قائم ہوا ہے۔ ہماری حقیقت کے لحاظ سے دیکھو تو ہم مردہ ہیں، اندھے بہرے، اپاہج، گونگے، بے حس خدا تعالیٰ کی حیات کی تجلی ہی سے ہم زندہ ہیں سمیع اور بصیر کے پرتو سے ہم دیکھتے ہیں۔ قدیر و مرید و کلیم کے اثر سے بالارادہ چلتے پھرتے اور بولتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھو کہ صوفیہ کے نزدیک وجود، وجودِ خارجی کو کہتے ہیں۔ اور ثبوت، وجودِ علمی کو۔

اللہ الصمد۔ صمد کے کئی معنی ہیں ٹھوس، مضبوط، ناقابل تغیر۔ وہ جو علت العلل ہو، بھلا وہ کیونکر متغیر ہوگا؟ محل تغیر تو ممکنات ہیں، مخلوقات ہیں۔ ان کے تغیرات کے علل و اسباب ہیں۔ واجب الوجود کے سوا ہے کیا کہ علت ہو۔

صمد کے دوسرے معنی ہیں سردار، جو علت العلل ہو، بالذات موجود ہو، وہ کیونکر سردار اور مالک نہ ہوگا۔

صمد کے تیسرے معنی ہیں بے نیاز، بے حاجت، صمدت الناقۃ (کھانے پینے سے ناقہ بے نیاز ہو گیا) ظاہر ہے کہ علت العلل کو سب سے مستغنی ہونا چاہئے، اور سب اس کے محتاج ہونے چاہئیں۔ یہاں ایک امر قابل توجہ ہے۔ اضافیات میں مضاف کی ضرورت ہے مثلاً خالق کا لفظ اسی وقت صادق آئے گا جب کہ مخلوق ہو۔ اسی طرح رب کے لیے مربوب کی ضرورت ہے پس صمدیت کہاں رہی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے استغنا سے استغنائے ذاتی مراد ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ گدا بادشاہ کو کہے کہ اے مالک! اے سخی! مانتا ہوں کہ میں تیرا سراپا محتاج ہوں۔ کھانے پینے میں۔ امن چین سے رہنے میں۔ مگر تو بھی تو اپنے اظہار سخاوت میں میرا محتاج ہے۔ اصل یہ ہے کہ اضافیات و سلبیات صفاتِ ذاتیہ میں سے نہیں ہوتے۔ نہ ان کے ظہور سے

ذات میں کچھ ترقی ہوتی ہے۔ نہ ان کے عدم ظہور سے ذات میں کچھ کمی ہوتی ہے۔ نیز ظہور صنعت کے حدوث سے اصل صفت کا حدوث لازم نہیں آتا۔ ظہور کمالات کے لحاظ سے کلّ یوم ھو فی شان ہے مگر ذات صفات و اصل کمالات کے لحاظ سے الآن کما کان ہے۔

لم یلد و لم یولد۔ نہ اس کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ نہ ماں باپ۔ جب ثابت ہو گیا کہ وجود بمعنی ما بہ الموجودیت عین ذات حقہ ہے، نہ اس سے پہلے کوئی ہے، نہ اس کے بعد کوئی۔ نہ اس کا مثل کوئی ہے۔ نہ اس کے مقابل کوئی، تو اس کے ماں اور باپ کیسے ہو سکتے ہیں، اور اولاد کیونکر ہو سکتی ہے۔ ماں باپ اولاد سے پہلے ہوتے ہیں۔ ماں باپ اور اولاد میں مماثلت اور مشابہت ہوتی ہے۔ بھلا وجود سے پہلے کون ہو سکتا ہے۔ اور وجود کے مماثل کون؟ وجود حقیقی اور وجود بالعرض میں کیا مماثلت ہے؟ چودھویں رات کا چاند خوب چمک دکھائے، مگر ایک دانا کی نظر میں ہے وہی کالا توا۔ عدم ظلمت ہے، وجود نور ہے۔ وجود ہی علم ہے، وجود ہی کمال ہے سے۔

اے ذات تو مجمع الکمالات — میں بھی ہوں کمال بے کمالی

عدم کے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ جو کچھ ہے وجود کا کرشمہ ہے علم کے مطابق قدرت کا تماشا ہے۔ ممکن جس کا عدم وجود برابر ہے وہ نہ پہلے کچھ تھا نہ اب کچھ ہو گا۔ بالعرض پر کچھ ایسی نظر جم گئی ہے کہ بالذات کی طرف راستہ ہی نہیں ملتا

کاخ وحدت کا بن گیا دربان — وہم باطل بھی کیا قیامت ہے

ولم یکن لہ کفواً احد۔ کوئی اس کا کفو نہیں ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وجود کا مقابل کوئی نہیں۔ ہو سکتا تھا تو عدم ہو سکتا تھا۔ مگر عدم کیا ہو گا۔ ہونا تو وجود کا کام ہے اور وجود عین ذات حق ہے۔ پھر نادار یا مفلس ممکن و عدم کے پاس کیا دھرا ہے کہ ہو، اور ہو بھی ایسا کہ اس کا مقابل ہو۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ وجود کا کفو کوئی نہیں۔ وہ بے مثل ہے، بے نظیر ہے، وحدہٗ لاشریک لہٗ۔

اللھم ارنا حقائق الاشیاء کما ھی، توفنا مسلمین و الحقنا بالصالحین۔ اللھم ارنا الحق حقاً و ارزقنا اتباعہ و ارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنابہ

حاملان قرآن

حضرت شیخ عبد القادر العمادی

بیانحضرت آیات کردگار ربیا

از جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

ابو محمد کنیت، عبد القادر نام، شیخ اکبر خطاب، خلیفۂ سنت، امام کتاب، واتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب۔ حضرت کے آیات وکرامات وفضائل تقوی وحقائق ومعارف عرف طیب سے بھی اعرف ہیں شیخ الاسلام امیر سید شاہ باسط علی قلندر رضی اللہ عنہ کی جناب سے خلافت کبریٰ پر فائز تھے تکیۂ شریفہ سوگھر پور میں ایک درسگاہ قائم فرمائی تھی جس میں دو سو طلبہ مقیم رہتے، اور ایک خانقاہ بنوائی تھی کہ اس میں بھی دوسو آزادگان قلندر مشتغل بحق ہوتے حضرت ان سب کو وحی اور تنزیل کا درس دیتے اور طعام صبح وشام میں سب کے ساتھ شریک ہوتے، مواقیت خمسہ میں بغیر کسی طرح کے مسجد جامع میں "ارکعو مع الراکعین" کا اہتمام والتزام فرماتے اب اس مدرسہ اور اس خانقاہ کی یادگار دل میں ہے، زمین میں بہ بل بوتا کہاں کہ دیر تک آسمان کا بوجھ اٹھائے رہے۔

مدارس آیات خلت عن تلاوۃ ۔۔۔ ومہبط وحی مقفر العرصات

گیارہ سو چالیس میں پیدا ہوئے اور سترھویں رمضان بارہ سو دو میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے کہ یہی قسطنطنیہ میں سلطان عبد الحمید خان اول اور شاہجہان آباد (دہلی) میں خواجہ میر درد کا سال وفات

بھی ہے۔ ترجمۂ طاہرہ مبسوطات سیرت میں مدون ہے یہاں صرف افادات قرآن پر اقتصار ملحوظ ہے اور وہ بھی نہایت مجمل۔

فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ

بارش نہ ہو تو پھول شبنم ہی سے شگفتہ ہو جاتے ہیں۔

قضا و قدر حلقۂ درس میں قلب جبار و متکبر کی بحث تھی اور آیۂ کریمہ "کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ" سے ہر فریق استناد کرتا تھا۔ ایک فریق کہتا تھا۔

کذٰلِکَ یطبعُ اللّٰہُ یدلّ علیٰ ان الکل من اللّٰہ

اسی طرح اللہ طبیعت بنا دیتا ہے' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

دوسرا فریق کہتا تھا۔

کذلک یطبع اللّٰہ علےٰ کل قلب متکبر جبار یدل علیٰ انّ ھٰذا الطبع انما حصل من اللّٰہ لانہ کانَ فی نفسہ متکبراً اجباراً

"اسی طرح اللہ ہر ایک متکبر اور جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے (یعنی ویسی ہی طبیعت بنا دیتا ہے)" یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کی جانب سے یہی طبیعت حاصل ہوئی ہے کیونکہ ایسا شخص فی نفسہٖ متکبر اور جبار تھا۔

بحث سے جب شرارے نکلنے لگے تو فریقین کو حضرت سے استفاضہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اسباب قضا فرمایا۔

ان اللّٰہ یخلقُ دواعی الکبر فی القلب فتصیر تلک الدواعی مانعۃ من حصول ما یدعوا الی الطاعۃ والانقیاد لامر اللّٰہ

اللہ تعالیٰ دل میں تکبر کے اسباب و محرکات پیدا کر دیتا ہے' یہی محرکات ہیں جو اللہ کا حکم بجا لاتے اور اس کی اطاعت کرنے سے روکتے ہیں۔

فالآیۃ حجۃٌ لکل واحدٍ منکما من وجہٍ

اس بنا پر یہ آیت ایک طور پر تم دونوں فریقوں کے

وعلی فریق ذا احد من وجہِ آخر — یہ وجہ استدلال ہے، اور دوسرے طور پر ایک فریق کے مخالف ہے۔

وَیخلق دواعی الکبر فی القلب یکون القول — قلب میں اسباب ومحرکات تکبر کے پیدا کر دینے کے

بالقضاء والقدر حقاً ویکون تعلیل الصد — معنے یہ ہوئے کہ قضا وقدر کا عقیدہ برحق ہے ہجبار و

عن الذین یکون متجبراً متکبراً باقیاً۔ — متکبر ہونے کی بنا پر دین اسلام سے رکنے یا ہٹ جانے کی علت بھی اس صورت میں بدستور باقی رہتی ہے۔

کبر و جبروت | رہی یہ بات کہ متکبر اور جبار کسے کہتے ہیں؟ مفسرین اس میں تھوڑی سی تفریق کرتے ہیں کہ متکبر تو وہ ہے جو قبول حق توحید سے تکبر کرے، اور جبار وہ ہے جو غیر حق میں جبار ہو۔

وکمال السعادۃ فی امرین — انسان کی سعادت اور نیکبختی کا کمال دو امروں میں ہے،

التعظیم لامر اللہ — اللہ کے حکم کی تعظیم۔

والشفقۃ علی خلق اللہِ — اور اللہ کی مخلوق پر شفقت۔

فالتکبر کالمضاد للتعظیم لامر اللہ و — اس بنا پر تکبر تو گویا اللہ کے حکم کی تعظیم کی ضد ہے۔ اور

الجبروت کالمضاد للشفقۃ علی خلق اللہ — جبروت گویا اللہ کی مخلوق پر شفقت کی ضد ہے۔

طرح فرعون | عرض کی:۔

اسی آیت کے بعد بنائے صرح کا تذکرہ ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

فرمایا:۔ بنائے صرح کی پوری آیت یوں ہے:۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ یَاهَامَانُ ابْنِ لِی صَرْحًا — فرعون نے کہا:۔ اے ہامان میرے واسطے ایک اونچا

لَعَلِّی أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ أَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ — محل بنواؤ، شاید میں راستے تک پہنچ سکوں، وہ راستے

فَأَطَّلِعَ إِلٰى إِلٰهِ مُوسٰى وَإِنِّی لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا — جو سماوات کے ہیں کہ اس پر چڑھ کے موسیٰ کے معبود کو جھانک

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۔

دیکھوں موسیٰ اٹکل ہیں تو وہ جھوٹا ہے۔ اسی طرح فرعون کو اس کے برے کام بھلے دکھائی دیے۔ اللہ کی راہ پر چلنے سے وہ روک دیا گیا، اور فرعون کے داؤ پیچ ہلاکت اور زیاں کاری ہی میں رہے۔

تحقیق بناء صرح | مصر میں فرعون کے آثار آج بھی نمایاں ہیں اور سب کے سب اس کی عظمت سلطنت کی شہادت دیتے ہیں، کہنے کو تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا سے مطلع ہونے کے لیے فرعون جو بڑی اونچی عمارت بنوانا چاہتا تھا وہ یہی اہرام مصر ہیں کہ جیزہ کے علاقہ میں آج بھی سر اٹھائے ابر سے باتیں کر رہے ہیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ایک ایسی متمدن قوم اور ایسی متمدن سلطنت کا فرماں روا ایسا نادان تھا کہ کسی بلند عمارت پر چڑھ کر خدا کو دیکھ سکنے کا خیال رکھتا تھا؟

بنائے تحقیق | فکل عاقل یعلم بدیہۃ عقلہ انہ یتعذر فی قدرۃ البشر وضع بناء یکون ارفع من الجبل العالی ویعلم ایضا بدیہۃ عقلہ انہ لا یتفاوت فی البصر حال السماء بین ان ینظر الیہ من اسفل الجبال وبین ان ینظر الیہ من اعلی الجبال واذا کان ہذان العلمان بدیہیین امتنع ان یقصد العاقل وضع بناء لیصعد منہ الی السماء ۔

ہر ایک عقلمند بدیہی طور پر اپنی عقل سے جانتا ہے کہ کسی ایسی عمارت کا بنانا جو اونچے پہاڑ سے بھی بلند ہو انسان کی قدرت و استطاعت سے متعذر ہے۔ عقلمند آدمی اس حقیقت کا بھی بدیہی طور پر علم رکھتا ہے کہ چاہے پہاڑ کے نیچے سے دیکھے اور چاہے پہاڑ کے اوپر سے مشاہدہ کرے، جس طرح چاہے دیکھے آسمان کی حالت میں کچھ تفاوت نظر نہ آئے گا، اور دیکھنے میں کچھ ایسا فرق محسوس نہ ہوگا۔ جب یہ دونوں باتیں بدیہی ہیں تو ناممکن ہے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسی عمارت [illegible] بنائے جس پر چڑھ کر آسمان تک پہنچ سکے۔

واذا كان فساد هذا معلوماً بالضرورة امتنع اسناده إلى فرعون	جب یہ کھلی ہوئی ناممکن بات ہے تو ایسے امر محال کو فرعون کی جانب منسوب کرنا قطعاً درست نہیں۔
فرعون کا مطلب کیا تھا لما عرف كل احد ان الطريق الى روية الله ممتنع كان الوصول الى معرفة وجود الله بطريق الحس ممتنعاً۔	جب ہر شخص نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی راہ رکی ہوئی ہے تو یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ حواس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو جاننے پہچاننے کے طریقے تک پہونچنا بھی ممکن نہیں۔
ونظيره قوله تعالىٰ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ۔	اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ "اگر تجھ سے ہو سکے کہ تو زمین میں ایک سرنگ تلاش کر کے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگا کے ان لوگوں کو کوئی معجزہ دکھائے"۔
وليس المراد ان محمداً صلى الله عليه وسلم طلب نفقاً فى الارض أو وضع سلماً الى السماء۔	اس سے یہ مراد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین میں سرنگ یا آسمان تک سیڑھی لگانی چاہی تھی
بل المعنى انه لما عرف ان هذا المعنى ممتنع فقد عرف انه لا سبيل الى تحصيل ذلك المقصود	اس کے معنی یہ ہیں کہ جب یہ بات واضح ہو چکی کہ دیکھنے کے لئے سرنگ یا سیڑھی لگا کے اللہ تک پہنچنا محال ہے تو یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں
فكذا ههنا غرض فرعون من قوله "يا هامان ابن لى صرحاً"	فرعون کا ہامان سے یہ فرمائش کرنا کہ "میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا دے" یہی مدعا اس کہنے سے بھی ہے۔
يعني أن الاطلاع على اله موسى لما كان لا سبيل اليه الا بهذا الطريق فكان هذا	فرعون کا مطلب یہ تھا کہ موسیٰ کے معبود تک پہونچنے کی راہ یہی ہے کہ زمین پر سرنگ یا آسمان پر سیڑھی لگائیں،

الطریق ممتنعاً فحینئذٍ یظهر منه	اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ممکن نہیں، تو اس سے یہ بھی
نه لا سبیل الی معرفة الاله الذی	ظاہر ہوتا ہے کہ اس معبود کو جاننے پہچاننے کی سبیل بھی
یثبته موسیٰ۔	ممکن نہیں جس کو موسیٰ ثابت کر رہے ہیں۔
فرعون کی دلیل بے بنیاد تھی هذه الشبهة	بایں ہمہ یہ شبہہ فاسد ہے۔
فاسدةٌ۔	
لأن طرق العلم ثلاثةٌ	اس لیے کہ علم حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں۔
الحس	حس
والخبر	اور خبر
والنظر	اور نظر
ولا یلزم من طریقٍ واحدٍ وهو الحسُّ	کسی ایک طریقے کے معدوم ہونے سے کہ یہاں اس سے حس
انتفاء المطلوب	مراد ہے، ضروری نہیں کہ اصل مطلب بھی معدوم ہو جائے
وذلك لأن موسیٰ علیه السلام کان	دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون پر واضح کر دیا
قد بین لفرعون ان الطریق فی معرفة	تھا کہ معرفت الٰہی اور خدا شناسی کا طریقہ صرف استدلال
الله تعالیٰ انما هو الحجة والدلیل کما	ہے، اسی بنا پر کلام اللہ کے لفظوں میں حضرت موسیٰ نے
قال "ربکم ورب آبائکم الاولین"	کہا تھا کہ وہ معبود تم سب کا پروردگار ہے اور تمہارے
رب المشرقین ورب المغربین"	گذشتہ آباؤ اجداد کا پروردگار بھی وہی ہے" وہی مشرق
	ومغارب کا پروردگار بھی ہے۔
الا ان فرعون لخبثه ومکره تغافل	اس قطعی استدلال کے ہوتے ہوئے بھی فرعون نے
عن ذلك الدلیل والقی الجمال الله	اپنی خباثت سے کام لیا اور اس دلیل سے چشم پوشی کر کے

لما کان لاطریق الی الاحساس بهذا الالٰہ وجب نفیہ

جاہلوں کے ذہن نشین کر دیا کہ جب اس معبود کے محسوس کرنیکا کوئی طریقہ ہی نہیں تو بجائے موجود ہونے کے اس کا معدوم ہونا لازم ہوا۔

ہامان | عرض کی۔ ہامان کی حقیقت کیا ہے جس کو فرعون نے بنائے صرح کا حکم دیا تھا۔

فرمایا:۔

یہود کا اعتراض | زعموا ان هامان ماکان موجوداً البتۃ فی زمان موسیٰ و فرعون وانما جاء بعدهما بزمان مدید ودهر بعید فالقول بان هامان کان موجوداً فی زمان فرعون خطأ فی التاریخ۔

یہود کا زعم ہے کہ موسیٰ اور فرعون کے زمانہ میں ہامان ہرگز موجود نہ تھا۔ بہت طویل مدت کے بعد اس کا زمانہ آیا۔ لہٰذا یہ کہنا تاریخی غلطی ہے۔ کہ فرعون کے زمانے میں ہامان موجود تھا۔

مسلمانوں کا جواب | مفسرین اس کا جواب دیتے ہیں:۔

ان وجود شخص یسمّٰی بہامان بعد زمان فرعون لا یمنع عن وجود شخص یسمّٰی بہذا الاسم فی زمانہ۔

فرعون کے زمانے کے بعد ہامان نام کے ایک شخص کا موجود ہونا اس بات کا مانع نہیں کہ اسی نام کا ایک دوسرا شخص فرعون کے زمانہ میں بھی رہا ہو۔

اعتراض مزید | مخالفین اس پر اعتراض کرتے ہیں:۔

هذا الشخص المسمّٰی بہامان الذی کان موجودا فی زمان فرعون ماکان شخصاً خسیساً فی حضرۃ فرعون بل کان کالوزیر له

یہ شخص جس کا نام ہامان تھا اور جس کو فرعون کے زمانہ کا بیان کیا جاتا ہے کوئی ادنیٰ آدمی نہ رہا ہوگا بلکہ فرعون کے دربار میں وزیر کی حیثیت رکھتا ہوگا ایسا شخص اپنی صفت

اور اپنے حلیہ میں مجہول اور گمنام نہیں ہو سکتا، اگر اس کا وجود ہوتا تو اس کا حال بھی معروف اور نام بھی موجود ہوتا۔	ومثل ھذا الشخص لایکون مجھول الوصف والحلیۃ فلو کان موجوداً العرف حالہ
فرعون اور موسیٰ کے حالات کی جن لوگوں نے تحقیق کی ہے ان سب کا اتفاق ہے کہ ایک شخص جس کا نام ہامان بیان کیا جاتا ہے فرعون کے زمانہ میں موجود نہ تھا بلکہ اس کے بہت بعد پیدا ہوا، اس بنا پر ماننا پڑیگا کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے۔	وحیث اطبق الباحثون عن احوال فرعون وموسیٰ ان الشخص المسمی ھامان ماکان موجوداً فی زمان فرعون وانما جاء بعدہ بادوار علم انہ غلط وقع فی التواریخ۔

نظائری تائید | اس طرز استدلال پر مخالفین نے بڑا زور لگایا ہے اور اس کی تائید و تقویت میں نظائر سے بھی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

مخالفین نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ نظیر پیش کی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں ابوحنیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہوئے تھے۔	قالوا ونظیر ھذا ان نعرف فی دین الاسلام ان اباحنیفۃ انما جاء بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔
اب اگر کسی شخص نے دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایک ابوحنیفہ موجود تھے جو امام ابوحنیفہ کے علاوہ ایک دوسرے بزرگ گذرے ہیں اگرچہ نام ان کا بھی ابوحنیفہ ہی تھا، تو ایسے مدعی کے اس دعویٰ کو مورخین قطعاً غلط قرار دینگے یہی صورت یہاں بھی ہے۔	فلو ان قائلاً ادعیٰ ان اباحنیفۃ کان موجوداً فی زمان محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام وزعم انہ شخص آخر سوی الاول وھو ایضاً یسمی بابی حنیفۃ فان اصحاب التواریخ یقطعون بخطئہ فکذا ھھنا

اسلام کا آخری جواب | مفسرین کی جانب سے اس کا آخری جواب یہ ہے ۔

ان تواریخ موسیٰ وفرعون قد طال العهد بها واضطربت الاحوال و الادوار فلم یبق علی کلام اهل التواریخ اعتماد فی هذا الباب	موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے عہد کی تاریخیں بہت ہی مضطرب ومغشوش ہیں زمانہ اتنا گزر چکا ہے کہ اب اس باب میں ان مورخین کے کلام پر اعتماد باقی نہ رہا ۔
بخلاف حال رسولنا صلے اللہ علیہ وسلم مع ابی حنیفة فان هذه التواریخ قریبة غیر مضطربة بل هی مضبوطة ۔	بخلاف اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امام ابو حنیفہ کے ہم زمانہ ہونے کی صورت جداگانہ ہے اس لیے کہ یہ تاریخیں قریب العہد ہیں مشکوک نہیں، بلکہ ضبط صحت کیساتھ مدون ہیں
فظهر الفرق بین البابین ۔	اس بنا پر ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان کتنا فرق ہے

نئی تحقیق | فرمایا مفسرین برحق ہیں، مگر تتبع سے مجھے تو ایک اور ہی حقیقت نظر آتی ہے، حضرت عکرمہؓ کی حدیث میں ہے :—

کان علیٌ اعلم بالمهیمات	حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مُہیمات کا یعنی ان باتوں کا جو قابل اہتمام ہوں اور اہمیت رکھتی ہوں، سب سے زیادہ علم تھا مُہیمات کو ایک دوسری روایت میں "مُہمات" بھی کہا گیا ہے۔ مگر اس کے معنی بھی یہی ہیں ۔ عرب کہتے تھے:۔
هم لنفسك ۔	اپنے لیے اہتمام کرو ۔
ولا تهم لهولاء	ان لوگوں کے لیے اہتمام نہ کرو ۔

تمام ائمہ ادب نے اس محاورہ کے یہی معنی بیان کئے ہیں کہ "اطلب لنفسك واهتم لها واحتل"

یہ بھی محاورہ ہے :—

فلانٌ لایہتام لنفسہ — فلاں شخص اپنے لیے کوئی اہتمام نہیں کرتا یہاں بھی "لاءیھتام"
کے معنی "لایحتال" مذکور ہیں، اخطل کا کلام بھی اسی کا مؤید ہے:-

فاھتم لنفسك یا جُمیعُ و لا تکن
لبنی قریبة و البطون تھیم

ان تمام الفاظ و محاورات کو ملحوظ رکھیے کہ سب کا مادہ وہی ہے جو ہامان کا ہے۔

قول فیصل فرمایا:- اس بنا پر اگر ایسے شخص کو جو بڑے بڑے کاموں کے اہتمام و انتظام کا خاص ملکہ رکھتا ہو "ہامان" کہتے ہوں، اور اسی اہتمام کرنے والے کو فرعون نے ہامان کے نام سے مخاطب کیا ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہاں ہامان سے اس نام کا کوئی شخص مراد نہیں بلکہ اس لفظ کے معنی مراد ہوں گے، یعنی عمدہ اہتمام و انتظام کرنے والا۔ واللہ اعلم۔

رسائل و مسائل

آیۂ ختم نبوت کا مفہوم

"آیت خاتم النبیین کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے اعتراض کے جواب میں نازل فرمائی گئی ہے جنہوں نے آنحضرت صلعم پر رسومات قدیم کی بنا پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ نے متبنٰی کی مطلقہ سے نکاح کیا جس کی حرمت ایسی ہی ہے جیسی صلبی بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لینے کی حرمت اس کا جواب آیت خاتم النبیین سے دیا گیا ہے۔

اب آیت خاتم النبیین ملاحظہ کیجئے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (۳۳، ۵)۔

اس آیت کے چار ٹکڑے ہیں:-

(۱) ماکان محمدٌ ابا احدٍ من رجالکم یعنی تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں

(۲) ولکن رسول اللہ - مگر وہ اللہ کے رسول ہیں۔

(۳) وخاتم النبیین - اور خاتم ہیں انبیا کے۔

(۴) وکان اللہ بکل شیءٍ علیما - اور اللہ ہر چیز جانتا ہے۔

فقرہ نمبر اول پر غور کرنے سے تو جواب مل جاتا ہے جو بالکل معقولی رنگ اپنے اندر رکھتا ہے کہ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، اور زید تمہارے مردوں میں سے ایک مرد ہے لہذا

محمد صلی اللہ علیہ وسلم حقیقی معنوں میں اس کے باپ نہیں ہیں، اور جب وہ اس کے باپ نہیں ہیں تو زید ان کا بیٹا بھی نہیں۔ اور جب زید ان کا بیٹا نہیں تو زید کی بیوی ان کی بہو بھی نہیں اور جب زینب ان کی بہو نہیں تو زید کے طلاق دینے کے بعد وہ ان پر حرام کیسے ہو سکتی ہے۔

مگر اس کے بعد کا فقرہ ہے ولکن رسول اللہ اور تیسرا فقرہ وخاتم النبیین اور چوتھا فقرہ وکان اللہ بکل شیءٍ علیماً ہے جس طرح پہلے فقرے کا اعتراض کے جواب کے ساتھ نہایت معقول اور موزوں تعلق معلوم ہوتا ہے؛ اور ہر ایک کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اعتراض کا جواب اس میں نہایت صفائی اور مناسبت سے دیا گیا ہے، اس طرح بعد کے فقروں کا کوئی ربط سیاق کلام کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ رسول کی رسالت اور ختم نبوت اور اللہ کے علیم ہونے کا ذکر یہاں کیا مناسبت رکھتا ہے، اور ابتدائی فقروں سے اس بیان کو کیا ربط ہے؟

خاکسار

ابوالبرکات وکیل ۔ حیدرآباد دکن

ترجمان القرآن ۔ آپ نے اس سے پہلے کی آیت پر غور نہیں فرمایا۔ اسی لیے ربط کلام کی جہت سمجھ میں نہیں آئی۔ کلام کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ حضرت زید نے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ تھے اپنی بیوی سیدہ زینب بنت جحش کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا حضور نے ان کو حکم دیا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب آیت ۳۷) یعنی اپنی بیوی کو اپنی زوجیت ہی میں رکھ اور اللہ کا خوف کر۔ مگر زید طلاق کا عزم کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اس ارادہ کو پورا کر ڈالا، اور طلاق دے دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ارادہ رکھتے تھے کہ حضرت زینب کے ساتھ نکاح فرمائیں، مگر اس خیال سے ہچکچا رہے تھے کہ لوگ اس پر باتیں بنائیں گے کہیں گے کہ یہ کیسا نبی ہے جو ایک شخص کو بیٹا بھی بناتا ہے اور پھر اس کی مطلقہ بیوی سے شادی بھی کرتا ہے۔ حضور کو خوف تھا کہ منافقین اور کفار کی ان چہ میگوئیوں سے کہیں مسلمانوں کے

ایمان میں فرق نہ آجائے یا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو اور اپنے جاہلانہ مزعومات کے خلاف ایک ایسے فعل کا صدور آپ سے دیکھ کر اس کا دل پھر جائے، جس کو وہ عام خیال کے بموجب مکروہ سمجھتا ہے۔ حضور چونکہ اشاعت اسلام کے لیے بے انتہا حریص تھے اس لیے آپ نے خیال فرمایا کہ ایک چھوٹے سے فائدے یعنی محض ایک جاہلانہ خیال کا ابطال، اور ایک فعل کا جواز ظاہر کرنے کے لیے ایک بڑے فائدے یعنی اشاعت اسلام کو کیوں نقصان پہنچایا جائے۔ اسی وجہ سے آپ اپنے دل میں اس ارادے کو چھپائے ہوئے تھے، اور اس پر عمل درآمد کرنے میں تامل فرما رہے تھے جیسا کہ

(احزاب آیت ۳۷) ترجمہ ...

وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا مقصد اور تھا۔ دنیا نہ جانتی تھی، اور شاید خود حضور اکرم کو بھی اس وقت تک یہ نہ بتایا گیا تھا کہ حضور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، اور اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے اپنی شریعت کی تکمیل اور اپنے بندوں پر اپنی نعمت کا اتمام کرانا چاہتا ہے، اور ارادہ الٰہی یہ ہے کہ باب نبوت بند ہونے سے پہلے اللہ کا قانون بتمام وکمال ظاہر اور نافذ کر دیا جائے تاکہ کوئی چیز ایسی چھوٹنے ہی نہ پائے جس کو بندوں تک پہنچانے کے لیے پھر کوئی نبی بھیجنے کی ضرورت داعی ہو اور نہ جاہلیت کا کوئی ایسا اثر باقی رہ جائے جس کو مٹانے کے لیے پھر کسی پیغمبر کا آنا ضروری ہو۔ یہ مصلحت عظمیٰ بندوں کی نظر سے پوشیدہ تھی، مگر اللہ اس کو جانتا تھا۔ اس نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم ہرگز کسی کی چہ میگوئیوں کا خوف نہ کرو اور بلا تامل زینب سے نکاح کر لو تاکہ اہل ایمان سے قانون کا یہ مسئلہ پوشیدہ نہ رہ جائے کہ منہ بولا بیٹا اصلی بیٹا نہیں ہے اور اس کے احکام وہ نہیں ہیں جو صلبی اولاد کے ہوتے ہیں۔ لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي

(احزاب آیت ۳۷) ترجمہ — تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے

أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ۔ اول تو احکام الٰہی کے اظہار و بیان اور ان کے مطابق عمل درآمد کرنے میں تم کو کسی کا خوف ہی نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کا خوف کیا جائے (وَتَخْشَى

(احزاب آیت ۳۷)

النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ)۔ دوسرے تم تو ہمارے رسول ہو، تمہارے لیے جو چیز ...

ٹھیرا دی ہے، اس پر عمل کرنے میں کوئی امر تم کو مانع نہ ہونا چاہیے۔ (مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ) تم سے پہلے بھی تمام پیغمبر اسی طرح سے ہمارے احکام بیان کرتے اور ان پر عمل کرتے رہے ہیں (سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ) اور ان احکام کو ظاہر اور نافذ کرنے میں انہوں نے خدا کے سوا کبھی کسی کی مخالفت یا ملامت کی پروا نہیں کی ہے (اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ) (توبہ ۳۹) تیسری بات جو سب سے زیادہ اہم ہے، اور جس سے تمہارے علاوہ تمام مسلمانوں کو بھی باخبر ہونا چاہیے، وہ یہ ہے کہ تم نہ صرف اللہ کے رسول ہو جس کا کام ہی ہے کہ کسی کی پروا کیے بغیر اللہ کے احکام نافذ کرے، بلکہ خصوصیت کے ساتھ تم پر اس معاملہ میں زیادہ ذمہ داری اس وجہ سے عائد ہوتی ہے کہ تمہارے بعد نبوت کا سلسلہ ختم کیا جا رہا ہے اور ناگزیر ہے کہ تمہارے ذریعہ سے ہمارے قانون کے تمام ضروری احکام نافذ ہو جائیں۔ اگر ہم تمہارے بعد بھی کوئی نبی بھیجنے والے ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ اپنے قانون کی بعض دفعات بعد والے نبی کے لیے روک لیتے۔ مگر اب تو تمہارے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اس لیے تم کو اور تمہارے ذریعہ سے تمام مسلمانوں کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ تمہارے ہی ہاتھوں سے جاہلیت کے آثار میں سے ایک ایک اثر مٹایا جائے گا، قانون الٰہی کی دفعات میں سے ایک ایک دفعہ نافذ کرائی جائے گی، اور اس میں کسی کے جذبات، معتقدات، مزعومات کی پروا نہ کی جائے گی۔

یہ وہ مضمون ہے جو آیات کی ترتیب اور ان کے تسلسل پر غور کرنے سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے لیکن اب آیت کے الفاظ پر بھی غور کیجیے مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ کہنے کے بعد جو وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کہا گیا اس میں وجہ ربط یہ ہے کہ اول تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم زید کے حقیقی باپ ہی نہیں ہیں۔ اس لیے اس مصاہرت کی کوئی حقیقت نہیں جس کی بنا پر زینب ان پر حرام ہو۔ اور ان کے ساتھ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح کرنے پر کوئی اعتراض کیا جا سکے دوسرے

جس وجہ سے ان کا زینب کے ساتھ نکاح کرنا ضروری ہوگیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور رسول بھی ایسے ہیں کہ ان کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں ہے، اس لیے ان کے ذریعہ سے نہ صرف شریعت کے اس مسئلہ سے تم کو آگاہ کرنا ضروری ہے کہ منہ بولے بیٹے کے احکام صلبی اولاد کے سے نہیں ہیں بلکہ خود ان سے عمل درآمد کرا دینا بھی ناگزیر ہے تاکہ تمہارے دلوں سے اس فعل کی کراہیت نکل جائے اور تم ایک حلال و جائز امر کو محض جاہلیت کی وجہ سے برا نہ سمجھتے رہو۔ اس کے بعد کل شئی علیماً فرمایا گیا۔ اس سے دو فائدے نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم جاہل ہو متبنّٰی کی مطلقہ بیوی سے تم نکاح کرنا مکروہ سمجھتے ہو۔ مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ اس فعل میں کوئی امر قابل کراہت نہیں۔ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ (احزاب رکوع ۱)

دوسرے یہ کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس غلط اور جاہلانہ رسم کو توڑنا کیوں ضروری ہے۔ اس راز کو تم نہیں جانتے۔

اس کے علاوہ اس آیت میں چند لطائف بھی ہیں مثلاً یہ کہ آیت اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ میں تمام امت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پدر (احزاب آیت ۶) معنوی ہونے کی طرف جو اشارہ کیا گیا تھا اس کو یہاں زیادہ واضح کر دیا گیا۔ اگرچہ موقع و محل صرف اس امر کی تصریح کا مقتضی تھا کہ زید حضور کا حقیقی بیٹا نہیں ہے مگر حق تعالیٰ نے اپنے کلام بلیغ میں اس مفہوم کو یوں ادا فرمایا کہ گو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی کے بھی حقیقی باپ نہیں ہیں۔ مگر باپ سے بڑھ کر ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں۔ باپ کی کسی بات پر اعتراض کرو گے یا دل میں برا سمجھو گے تو محض بدتمیزی یا گستاخی یا حد سے حد معصیت ہوگی۔ مگر یہ ایسے باپ ہیں کہ اگر ان کی طرف سے تمہارے دل میں بدگمانی کا شائبہ بھی پیدا ہوگیا تو ایمان ہی سلب ہو جائے گا۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ذکور میں سے کسی کے زندہ نہ رہنے کی وجہ بھی

ایک نہایت بلیغ انداز میں ظاہر کردی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ انبیا داولوالعزم کی اولاد میں سے کسی نہ کسی کو ضرور منصب نبوت سے سرفراز فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کو دیکھیے آپ کے دو بیٹے ہوئے اور دونوں نبی ہوئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سردار انبیا پیدا کئے گیے۔ حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ حضرت داؤد، سلیمان، زکریا، یحییٰ، اور عیسیٰ، علیہم السلام پیدا ہوئے۔ اس قاعدے کے موجب اگر حضور رسولؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ذکور زندہ رہتی تو ان میں سے بھی کسی کو نبوت سے سرفراز کیا جاتا جیسا کہ خود حضور نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے حق میں فرمایا ہے کہ لوعاش لکان نبیا اگر زندہ رہتا تو ضرور نبی ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نبوت ختم کردی جائے۔ اس لئے اس نے آپ کے صاحبزادوں کو بچپن ہی میں اٹھالیا، اور آیت زیر نظر میں اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ محمدؐ خاتم النبیین ہیں، اس لیے ان کو تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں بنایا گیا۔

ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کہنے کے بعد وکان اللہ بکل شیء علیما۔ ارشاد فرمانے میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس امر سے متعلق ہوچکا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اور جس بات سے اللہ کا علم متعلق ہوچکا ہو اس کا غلط ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ لہٰذا آپ کے بعد کوئی شخص ہرگز ہرگز نبوت سے سرفراز نہ ہوگا جو شخص اللہ کو سچا اور اس کے علم کو حقیقی مانتا ہے وہ کسی ایسے شخص کی تصدیق نہیں کرسکتا جو آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے کیونکہ اس کی تصدیق علم الٰہی کی تکذیب ہوگی اور علم الٰہی کی تکذیب کسی دل میں ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

تقریظ و انتقاد

تفسیر سورۃ الفیل علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

از جناب مولوی ابواللیث شیر محمد صاحب ندوی

ترجمان القرآن کے ناظرین میں شاذ ہی ایسے لوگ ہوں گے جو علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے واقفیت رکھتے ہوں۔ مولانا حمید الدین مرحوم کی ہستی اس آخری صدی کے اندر وہ ہستی تھی جو گوناگوں خصوصیات کی مالک تھی۔ مولانا کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تفسیر اور قرآن فہمی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی میں اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آج سے تین سال قبل کا واقعہ ہے کہ متھرا کے کفرستان میں اسلام کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ مولانا کے انتقال سے علم وفن کو جو شدید نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مولانا کی شخصیت سے واقف ہیں۔

یوں تو قدرت نے مولانا کو ہر قسم کی قابلیتیں عطا فرمائی تھیں، فارسی، انگریزی اور عربی کے ماہر تھے لیکن درحقیقت ان تمام چیزوں میں جو چیز آپ کو تمام لوگوں پر ممتاز کرتی ہے وہ قرآن فہمی ہے۔ آپ کی کد و کاوش کا اصلی میدان قرآن تھا جس کے لیے آپ نے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ گو آپ حیدرآباد میں ایک گراں قدر مشاہرہ پر ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے لیکن آپ نے قرآن کے لیے مناصب اور زر و جواہر کی کوئی پروا نہیں کی اور ان سب چیزوں کو ترک کر کے اپنے کو کتاب الٰہی کے لیے وقف کر دیا۔ آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ، شہرت پسندی کی راہ سے ہٹ کر اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر صرف قرآن کے اسرار حل کرنے میں صرف فرما دیا لیکن افسوس کہ مولانا نے جو کچھ جانا اور سمجھا، ابھی اس کا ایک حصہ بھی بتا اور سمجھا نہ سکے تھے کہ عمر کے ایام ختم ہوگئے اور یہ

آفتاب علم ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

مولٰنا کے انتقال سے اہل علم کو جو صدمہ پہنچا اور علم و فن کو جو شدید نقصان لاحق ہوا، اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا لیکن خوش قسمتی سے مولٰنا نے اپنے پیچھے اپنی تحقیقات کا ایک کافی ذخیرہ چھوڑا ہے جس کی اشاعت سے اس نقصان کی کچھ تلافی ہوسکتی ہے جو مولٰنا کے انتقال سے ہوا ہے۔ مولٰنا نے جو مسودات چھوڑے ہیں وہ تمام تر تفسیر قرآن، بلاغت قرآن، حکمت قرآن، نظم قرآن، تاریخ قرآن اور اسلوب قرآن وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اگر یہ مسودات چھپ جائیں تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن فہمی کی راہ سے بہت سی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ افسوس کہ یہ قیمتی خزانہ بھی ابھی تک لوگوں کی بے توجہی کی وجہ سے سربمہر ہوا رہا اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اب تک اس کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ ہوسکا لیکن مخدومی جناب ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب سول سرجن بارہ بنکی اور جناب حفیظ احمد صاحب منصف حیدرآباد قابل ستائش اور مبارکباد ہیں کہ ان کی کوششوں سے، مولٰنا کی عربی تصانیف میں سے سورۃ الفیل کی تفسیر چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔

یہ تفسیر اپنے مضامین کے اعتبار سے بالکل نئی ہے۔ اس میں کل پندرہ فصلیں ہیں جن میں ایسے مباحث ہیں جن سے آپ کے کان غالباً اس سے پہلے آشنا نہ ہوئے ہوں گے۔ پہلی فصل میں سورہ کے مشکل الفاظ کی تشریح ہے اور دوسری فصل میں اس پر بحث ہے کہ الم تر کا مخاطب کون ہے۔ عام طور سے مفسرین یہی کہتے ہیں کہ اس سورہ میں آں حضور صلعم کو خطاب کیا گیا ہے لیکن مولانا کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ مولانا کے نزدیک اس سورہ کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنھوں نے واقعۂ فیل کو بچشم خود دیکھا ہے یا جن کو دیکھنے والوں کے ذریعہ سے اس کا علم یقینی حاصل ہوا ہے۔ مولانا نے قرآن سے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع کو صیغۂ واحد کے ساتھ خطاب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ چار اسباب ذکر کیے ہیں جن کی بنا پر مولانا نے عام مفسرین کے خلاف، مخاطب کے بارے میں رائے قائم کی ہے

ان اسباب کی تفصیل، تطویل کی باعث ہوگی لیکن تیسرا سبب کسی قدر دلچسپ ہے اس لئے اس کا خلاصہ پیش کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

مولٰنا فرماتے ہیں کہ اگر "الم تر" کا مخاطب آنحضور صلعم کو قرار دیا جائے تو بجائے اس کے کہ اس سورہ سے مشرکین پر کوئی حجت قائم ہو مشرکین اس سے خود آنحضور صلعم پر حجت قائم کرنے لگیں گے کیونکہ آنحضور صلعم کو مخاطب فرض کر لینے کے بعد لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سورہ میں آنحضور صلعم کو تسلی دینی مقصود ہے کہ ہم نے جس طرح خانہ کعبہ کے دشمنوں کو شکست دی اسی طرح اپنے دشمنوں یعنی مشرکین کو بھی شکست دیں گے اس لیے تم صبر سے کام لو۔ ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھ کر، مشرکین عرب کو ضرور سنائینگے کیونکہ قرآن اسی لیے نازل ہوا ہے (وقرآنا فرقناه لتقرءه على الناس على مكث) اور مشرکین عرب سن کر یہ ضرور کہیں گے کہ ہم اللہ کی مدد کے زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم خانہ کعبہ کے کلید بردار ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیونکر ہمارے دشمنوں کو شکست دی؟ اس لیے معلوم ہوا کہ اس سورہ کا مقصود آنحضور صلعم کی تسلی اور مشرکین عرب کی تہدید نہیں ہے بلکہ اس کی غرض خاص انعامات کو یاد دلا کر مشرکین عرب کو توحید کی دعوت دینی ہے جیسا کہ بعد کی سورۃ میں اس کی تصریح ہے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ الم کا مخاطب مشرکین کو قرار دیا جائے نہ کہ آنحضور صلعم کو۔

تیسری فصل میں سورہ کا عمود بیان کیا ہے اور ماقبل اور مابعد کی سورتوں سے اس سورہ کا تعلق واضح کیا ہے کیونکہ مولانا اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کی نہ صرف آیتیں بلکہ سورتیں بھی باہمدگر مربوط ہیں۔ اس سورہ کا موضوع مولٰنا کے نزدیک یہ ہے کہ مشرکین عرب پر اللہ کا شکر ادا کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے اپنے گھر کی برکت سے ان کی اور ان کے شہر کی حفاظت کی ہے۔ اور اس کی بدولت ان کو نعمت فضیلت اور عزت عطا فرمائی ہے۔ اس کے بعد کی فصل میں وہ آٹھ وجوہ بتائے ہیں جن کی بنا پر خانہ کعبہ کی فضیلت تمام معابد پر ثابت ہوتی ہے۔ پانچویں فصل میں چند حقائق کا ذکر اور چند شبہات کا ازالہ کیا ہے

چھٹی فصل میں قرآن کے بیان کے مطابق واقعہ فیل کا خلاصہ ہے۔

اس کے بعد کی فصلیں بہت زیادہ معرکۃ الآرا ہیں۔ ان فصلوں میں مولانا نے بہت سی مشہور تاویلوں کی تردید کی ہے مثلاً عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ترمیہم کا فاعل طیر ہے اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ چڑیوں نے اصحاب فیل پر پتھر برسائے لیکن مولانا کا خیال ہے کہ چڑیوں کے ارسال کا ذکر بھی ایک انعام ہی کے واضح کرنے کے لیے کیا گیا۔ چنانچہ اگر خدا نے ان چڑیوں کو نہ بھیجا ہوتا تو اصحاب فیل کی لاشوں کے سڑنے سے بیماریاں پھیل جاتیں اور وہاں رہنا دشوار ہو جاتا یہ خیال بالکل نیا ہے اس لیے کھٹکتا ہے اور اس میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اس کتاب کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جہاں کوئی شبہہ پیدا ہوتا ہے اس کا جواب بھی وہیں کتاب کے اندر مل جاتا ہے اس وقت موقع نہیں ورنہ چند شبہات اور ان کے جوابات کا خلاصہ پیش کرتا لیکن ناظرین اگر اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں گے تو میرے اس قول کی تصدیق کریں گے۔ بارہویں فصل تک حجارۃ ہی کے متعلق بحثیں ہیں۔ اس کے بعد وہ اسباب بیان کیے ہیں جن کی وجہ سے صحیح تاویل کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ ترمیہم سے پہلے طیر کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کا فاعل طیر ہی کو قرار دیا جاتا ہے لیکن مولانا کے نزدیک ترمیہم کا فاعل انت ہے۔ اور یہ جملہ یا تو مستانفہ ہے یا علیہم کی ضمیر سے حال واقع ہے۔ یہاں مولانا نے قرآن اور کلام عرب سے بہت سی مثالیں پیش کر کے یہ دکھلایا ہے کہ ضمیر مجرور سے عام طور پر حال واقع ہوتا ہے۔

اس کے بعد کی فصلوں میں رمی جمار کی حقیقت سے بحث کی ہے اور پھر متعدد دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ حج میں رمی جمار کی رسم بھی اسی واقعہ کی یادگار ہے اس کے بعد اخیر میں یہ دکھلایا ہے کہ اگر رمی جمار کو اس واقعہ کی یادگار قرار دیا جائے تو اس کو ادا کرنے کے وقت نفس پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

غرض یہ کتاب جدید مباحث اور گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ بقول شاعر۔ سہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اہل علم سے درخواست ہے کہ اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیں، اور مطالعہ سے قبل رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں مولانا کی جو تفسیریں اب تک شائع ہوی ہیں وہ دراصل مختلف سورتوں کی الگ الگ تفسیریں ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان ٹکڑوں کا مطالعہ زیادہ سودمند نہ ہوگا۔ کیونکہ جن سورتوں کی تفسیریں اب تک شائع ہوی ہیں یہ تمام سورتیں دراصل وہ ہیں جن میں کوئی خاص اشکال ہے یا جنمیں مولانا کوئی خاص رائے رکھتے ہیں۔ ان اجزا کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ ان سے قرآن سمجھنے کے اصول معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ کلید ہاتھ آتی ہے جس سے فہم قرآن کا دروازہ کھلتا ہے آخر میں میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف تمام تر عربی میں ہیں لیکن تفسیر کے جو مطبوعہ اجزا عربی میں تھے اس کے اکثر حصوں کا ترجمہ اردو دان طبقہ کے لیے مولانا کے لائق شاگرد مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے کر دیا ہے اور دراصل یہ حق بھی انہیں کا تھا۔ سورۃ الفیل کا ترجمہ بھی تیار ہے لیکن دیکھیے اس کی طباعت اور اشاعت کا کب انتظام ہوتا ہے۔

مطبوعات

تفسیر سورۃ الفیل تالیف مولانا عبدالحمید فراہی مرحوم ضخامت ۴۱ صفحات قیمت ۸ ر۔ مدرسۂ اصلاح سرائے میر اعظم گڈھ۔

مؤلف مرحوم کی شخصیت اس سے بالاتر ہے کہ اس کا تعارف کرانے کی حاجت ہو۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ متاخرین میں قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لحاظ سے بہت کم لوگ اس مرتبہ پر پہنچے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ممتاز فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کلام اللہ کے معانی کی تحقیق میں صرف کیا اور عربی زبان میں ایک ایسی محققانہ تفسیر لکھی جس کی نظیر متقدمین کی تصنیفات میں بھی کم ملتی ہے۔ زیر نظر رسالہ اسی تفسیر کا ایک حصہ ہے اس میں مؤلف نے کلام عرب کی شہادت، اور روایات صحیحہ کی تائید، اور قیاس عقلی کی تنقیح سے ان روایات اور تاویلات کو غلط ثابت کیا ہے جو واقعۂ فیل کے بیان اور سورۂ فیل کی تفسیر میں مشہور ہیں۔ عام طور پر تاریخوں میں لکھا ہے کہ ابرہہ نے جب مکہ پر حملہ کیا تو عرب اپنے معبد کو چھوڑ کر بھاگ گئے، اور عبدالمطلب نے ابرہہ کے پاس جا کر صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا، مگر کعبہ کے متعلق کچھ نہ کہا۔ مولف نے معاصر شعراء کے کلام سے اس کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عربوں نے ابرھہ کی پوری مدافعت کی تھی۔ سورۂ فیل کی تاویل میں ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ الم تر کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں بلکہ بالخصوص عربوں کی طرف ہے جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا تھا، اور بالعموم ان سب کی طرف جو متواتر و مشہور روایات کی بنا پر گویا عینی شاہدوں کے حکم میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مخاطب کر کے اپنی ان آیات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اصحاب فیل کی یورش کے موقع پر ظاہر ہوئیں۔ مشہور یہ ہے کہ اصحاب فیل جس عذاب سے ہلاک ہوئے وہ پرندوں کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔ اور انہوں نے کنکریاں مار مار کر ان ظالموں کو بھس بنا دیا تھا۔ مگر مؤلف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ عذاب

آندھی کی شکل میں تھا جس سے کنکریوں کی بارش ہوئی اور ابرہہ کی فوج کا بیشتر حصہ چیچک میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوگیا۔ رہے پرندے تو وہ مردہ لاشوں کو کھانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو مکہ اور اس کے اطراف میں وبا پھیل جاتی۔ آخر میں مؤلف نے ایک نہایت لطیف نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ حج کے موقع پر رمی جمار کی سنت اسی واقعہ کی یادگار میں جاری ہوئی ہے اور اصحاب فیل پر کنکریوں کی بارش اسی مقام پر ہوئی تھی جہاں اب رمی جمار کیا جاتا ہے۔

چینی مسلمان | تالیف بدرالدین چینی بی۔اے ضخامت ۲۴۲ صفحات قیمت عمر دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

دنیا کے ملکوں میں ہندوستان کے بعد مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد چین میں ہے، جہاں چار کروڑ سے سات کروڑ تک ان کی آبادی کا اندازہ کیا گیا ہے، مگر بارہ تیرہ صدیوں سے ان کے حالات اس قدر تاریکی میں رہے ہیں کہ دوسری مسلمان قوموں کو ان کے وجود تک کا علم نہ ہو سکا۔ زمانہ حال میں ہم کو مسلمانانِ چین کے متعلق کچھ تھوڑی سی معلومات حاصل ہوئیں، مگر وہ زیادہ تر فرنگی مستشرقین اور عیسائی مبشرین کی فراہم کردہ تھیں جن کا نقطۂ نظر اجنبی اور مخالفانہ تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارے سامنے خود ایک چینی مسلمان ہماری اپنی زبان (اردو) میں اپنی قوم کے حالات بیان کر رہا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے کئی سال تک ندوہ اور جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی ہے، اور اردو زبان میں اتنی اچھی استعداد پیدا کر لی ہے کہ اس کی تحریر پڑھ کر بعض مقامات پر یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا لکھنے والا ایک چینی ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ہم نے ایک ہی نشست میں اس کو پڑھ ڈالا، اور جب تک پوری ختم نہ کر لی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مصنف نے اس میں مجملاً مسلمانانِ چین کی گذشتہ تاریخ اور ان کی موجودہ دینی، علمی، معاشی، تمدنی، اور سیاسی حالت بیان کی ہے جس سے نہ صرف ایک دور افتادہ مسلم قوم کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ بہت سے مفید سبق بھی ہم کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ اسلام عہد عثمانیؓ میں بحری راستے سے اور عہد اموی میں بری راستے سے چین پہنچا اور نہایت احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی تہذیب کے ثمرات سے شاہانِ چین نے بہت کچھ استفادہ

اور چینی تہذیب کی تعمیر میں ان سے مدد لی۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط تک مسلمان اس ملک میں بہت عزت کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد مانچو خاندان کا دور شروع ہوا جس میں مسلمانوں کو ہر طریقہ سے تباہ و برباد اور ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب تک تقریباً ڈھائی سو برس مسلمانوں پر نہایت تنگی اور مصیبت کے ساتھ گذرے اس کے بعد جمہوریت اور آزادی کا دور شروع ہوا جس نے مسلمانوں میں زندگی کی ایک روح پھونک دی، اور ان کو از سر نو وہ عزت اور قوت حاصل ہوئی جس کو ظالم مانچو قوم نے ان سے چھین لیا تھا۔ اب چین میں پانچ قومیں آباد ہیں، جن میں عزت اور مرتبہ کے اعتبار سے مسلمانوں کا نمبر دوسرا ہے۔ اگرچہ مانچو قوم کے مظالم نے مسلمانوں کی قوت کو بہت کچھ توڑ دیا ہے لیکن اسلام نے اپنے پیروؤں میں قومی امتیاز، اور اپنی اسلامی قومیت پر فخر و ناز کی جو روح پھونک دی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈھائی سو برس تک پامال ہونے کے باوجود چینی مسلمان کی روح پامال نہ ہوئی اس نے اپنی تہذیب کو کسی طاقتور سے طاقتور چینی قوم کی تہذیب میں بھی ضم نہ ہونے دیا۔ اور اس وقت بھی وہ اتنی زبردست قومی طاقت رکھتا ہے کہ ایک طرف جاپان اپنی سیاسی اغراض کے لیے اس کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور دوسری طرف چینی جمہوریت اپنے وطن کی حفاظت کے لیے اس کی تائید حاصل کرنے پر مجبور ہے۔

مصنف نے مسلمانان چین کی کمزوریوں کا جو حال بیان کیا ہے وہی حال کم و بیش اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی ہے وہ کہتا ہے کہ چین کے مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کو کوئی ایسا رہنما میسر نہیں جو دین اور دنیا کو جمع کر کے انہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترقی کی راہ پر چلا سکے جو دینی پیشوا ہیں، وہ جاہل، تنگ نظر اور پست حوصلہ ہیں۔ جو دنیوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں ان کو دین سے کچھ بھی لگاؤ نہیں۔ اسی حالت کو محسوس کر کے بیدار مغز چینی مسلمان یہ کوشش کر رہے ہیں کہ دینی اور دنیوی تعلیم کو جمع کریں اور ایسے روشن خیال علماء پیدا کریں جو مسلمانوں کی صحیح رہبری کر سکیں اس کام میں

مسلمانان چین کو بڑی حد تک دنیائے اسلام کی ترقی یافتہ قوموں سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

الوحدۃ فی الاسلام - تالیف مولنا محمد طیب صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند ضخامت ۳۶ صفحات قیمت ۱۰/ ملنے کا پتہ کتب خانہ قاسمی دیوبند۔

یہ رسالہ اس ناگوار قضیہ کو حل کرنے کے لیے لکھا گیا ہے جو دارالعلوم دیوبند میں کچھ عرصہ سے سرپرست کے اختیارات اور مجلس شوریٰ کے آئینی حقوق کے متعلق چھڑا ہوا ہے۔ مؤلف نے اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں سرپرست یا صاحب امر کو شوریٰ کا پابند تو ضرور کیا گیا ہے، مگر اس کو کثرت رائے کے اتباع پر مجبور نہیں کیا گیا، اور نہ اس کے اختیارات کو محض توازن آراء کی صورت میں ترجیحی رائے (کاسٹنگ ووٹ) کی حد تک محدود کیا گیا ہے جیسا کہ آج کل جمہوری ادارات میں رائج ہے۔ فاضل مؤلف جمہوریت کے اس قاعدے کو اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی رائے میں جو لوگ اس قاعدے کی پابندی پر زور دے رہے ہیں وہ محض مغربی جمہوریت کے متبع ہیں۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مؤلف نے یہ رائے قائم کرنے میں جلدی کی ہے۔ اسلام میں درحقیقت کوئی ایسا قانون نہیں بنایا گیا ہے جو قطعی طور پر مرکزیت اور صرف مرکزیت کا حکم لگاتا ہو۔ قرآن میں چند اصول بیان کیے گئے ہیں جو حسب موقع مرکزیت اور جمہوریت دونوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے بھی موقع و محل کے لحاظ سے عمل کیا ہے۔ اور ارشادات نبوی بھی بالکل یک طرفہ نہیں ہیں۔ یہ کہنا کہ اسلام میں کثرت رائے پر کبھی فیصلہ کا مدار نہیں رکھا گیا اور نہ صدر کے لیے کاسٹنگ ووٹ کا طریقہ مقرر کیا گیا صحیح نہیں ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انتخاب خلیفہ کے لیے جو اصحاب شوریٰ مقرر کیے تھے ان میں کثرت رائے ہی پر فیصلہ کا مدار رکھا گیا تھا اور توازن آراء کی صورت میں حضرت عبدالرحمن بن عوف کو کاسٹنگ ووٹ کا حق دیا گیا تھا۔

دراصل اسلامی نظام جماعت میں اہمیت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ امت کا شیرازہ بندھا رہے، اس کے معاملات اجتماعی قوت کے ساتھ انجام پائیں اور فتنہ برپا نہ ہو۔ اس غرض کے لیے مرکزیت اور جمہوریت

جو طریقہ بھی انسب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور جو چیز فتنہ برپا کرنے والی ہو اسے چھوڑ دینا چاہیے خواہ وہ مرکزیت ہو یا جمہوریت۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ کثرت وقلت کا اسلام میں کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ یہ بات اس صورت میں صحیح ہے جب کہ مقابلہ حق اور باطل کا ہو لیکن جہاں خود اہل حق کے درمیان کسی جزوی مسئلہ میں اختلاف رائے ہو، وہاں کثرت رائے کو یقیناً ایک قابل لحاظ وزن حاصل ہو گا۔ اور ہونا چاہئے کسی معاملہ میں اہل حق کی ایک کثیر جماعت جو پہلو اختیار کرے وہ اس قدر حقیر نہیں ہو سکتا کہ اس کی کوئی پرواہی نہ کی جائے۔ اگر امیر قوم کو اکثریت کے خلاف عمل کرنے کا حق حاصل ہے بھی تو وہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ سواد اعظم کی رائے کو ٹھکرا دے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ جب امیر قوم کو اکثریت کے برسر غلط ہونے کا یقین کامل ہو جائے، اور وہ سمجھے کہ اگر اس نے اکثریت کی رائے پر عمل کیا تو ملت کے مصالح کو نقصان پہنچ جائیگا، تو ایسی مخصوص استثنائی صورت میں وہ اپنے اختیار مطلق کو استعمال کرسکے۔

رسول جہاں تالیف خانصاحب مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے ایل ایل بی، وکیل گوڑگانوہ (پنجاب)، ضخامت جیبی تقطیع کے ۶۰ اصفحات۔ پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجنے پر مل سکتی ہے۔

انجمن رفیق الاسلام گوڑگانوہ کی جانب سے مختلف اسلامی تعلیمات کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسالوں کی اشاعت کا مفید سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے "رسول جہاں" اس سلسلہ کا تیرہواں رسالہ ہے۔ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک کو نہایت شیریں اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے، اور تفصیلات کو چھوڑ کر حیات طیبہ کے ایسے ایسے واقعات چھانٹ لیے گئے ہیں جو تقوی اور اسلامی سیرت کی بہترین تعلیم دینے والے ہیں بچوں اور عورتوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہو گا۔

صدائے نسواں ماہوار رسالہ زیر سرپرستی بیگم صاحبہ مولنا محمد علی مرحوم چندہ سالانہ دو روپیہ دفتر صدائے نسواں، جامع مسجد دہلی سے طلب کیا جائے۔

اہل قلم کی ایک اچھی خاصی جماعت جس میں خواتین بھی ہیں، اور مرد بھی اس رسالہ کے ادارہ تحریر

میں شریک ہے۔ رسالہ کا مقصد مسلمان عورتوں کو اسلامی نصب العین کے مطابق ترقی کی راہیں بتاتا ہے۔ مضامین زیادہ تر عورتوں کی فہم کے مطابق عمدہ خیالات اور مفید دینی و دنیوی معلومات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

حقیقت سحر | تالیف مولٰنا محمد علی میر صاحب ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۴ر کتب خانہ قاسمی۔ دیوبند۔

اس رسالہ میں جادو کی حقیقت پر عالمانہ بحث کی گئی ہے مؤلف نے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جادو کیا ہے کیوں اور کس طرح موثر ہوتا ہے اس میں اور معجزہ و کرامت میں کیا فرق ہے، اور اس کی تاثیر کے حدود کیا ہیں لیکن درحقیقت یہ کائنات کے ایسے اسرار ہیں کہ ان کو لاکھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کیجئے ان کی حقیقت مستور کی مستور ہی رہتی ہے بلاشبہ فاضل مولف نے بحث و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے مگر غالباً ہمارا یہ گمان غلط نہیں کہ خود جادوگر بھی اپنے جادو کی حقیقت نہیں جانتے انہیں بھی بس اتنا ہی معلوم ہے کہ فلاں چیز کی فلاں تاثیر ہے۔

مکتبۂ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں یہ ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلباء کے لیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جاسکتی ہیں جو مصنفین و مولفین حیدرآباد اپنی تصانیف کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت معاملہ کا تصفیہ فرماسکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعراء اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر

فہرست مفت **مالک خواجہ بہاء الدین صاحب مکتبہ علمیہ چارمینار حیدرآباد دکن** طلب فرمایئے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات وصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

مینجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ معظم سٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)